Regd. L. No. 7243

Phone. 80000

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1976

اس پرچہ میں:

جھوٹ بولئے۔ اور دھڑلے سے بولئے۔

(صفحہ ۶)

اگلے شمارہ میں:

صحابۂ کبارؓ اور جماعت اسلامی۔

شائع کردہ: ادارۂ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ـــــ ۲۰ روپے غیر ممالک ـــــ ۲ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۲۹	جون ۱۹۷۶ء	نمبر ۶

فہرست

۱ - لمعات ـــــــــــــــ ۲

۲ - تتمۂ خطاب ـــــ متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۹

۳ - حقائق و عبر ـــ (۱) مہذب دنیا کی نئی نسلیں - (۲) ہمارا تاریک مستقبل! (۳) تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی! (۴) تصوف کی نیرنگیاں! (۵) کیا ہے کوئی رجلِ رشید؟ ـــــ ۲۵

۴ - تقریبات و اعلانات ـــــــــــ ۳۲

۵ - بزمِ مذاکرہ ـــ (طلوعِ اسلام کنونشن اکتوبر ۱۹۷۵ء) (قسطِ اوّل) ۳۳

۶ - حیاتِ قائدِ اعظمؒ کے نمایاں خط و خال ـــــــ ۵۱

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

گذشتہ یومِ اقبالؒ کی تقریب پر پرویز صاحب نے جو خطاب پیش کیا اس نے ملک میں بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ چنانچہ انہیں بہت سے استفسارات موصول ہوئے اور بہت سے نکات کی وضاحت چاہی گئی۔ وہ خطاب تو طلوعِ اسلام کی مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا لیکن یہ وضاحتیں حالیہ اشاعت میں چند صفحات بعد آپ کے سامنے آئیں گی۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے اس خطاب اور ان وضاحتوں کو الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کر دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو اہم نکتہ پرویز صاحب نے پیش کیا ہے اس کا ملخص ان لمعات میں دہرا دیا جائے۔

۱۸۷۰ء کے درمیان مرزا غلام احمد (قادیانی) ایک مناظر کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اس زمانے میں عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مسلمانوں کے مناظروں کا بڑا زور تھا۔ مرزا صاحب نے اس بنا پر اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی اور اس سلسلے میں جو کتاب (براہینِ احمدیہ) شائع کی وہ بھی بڑی مقبول ہوئی، یہاں تک کہ ملک کے بلند پایہ دانشوروں نے بھی اس کی تعریف کی۔ اس طرح مقبولیت حاصل کرنے کے بعد مرزا صاحب نے اپنے "مامور من اللہ" ہونے کے مختلف دعاوی پیش کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مناظرے خود مسلمانوں کے ساتھ شروع ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی اہمیت حاصل کر لی کہ مسلمانوں کو کسی اور طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہ رہی۔ ان کا بیشتر وقت، روپیہ اور توانائیاں انہی مباحث کی نذر ہو گئیں۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۳۵ء میں، علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ مرزا صاحب کی تحریک کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خالص سیاسی تحریک ہے جسے مذہب کا نقاب اوڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ انگریز نے جب یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ اپنی سلطنت قائم کرنا چاہی تو اس راستے میں اسے مسلمان سب سے بڑی رکاوٹ نظر آئے۔ اس نے محسوس کیا کہ:-

۱۔ مسلمان بڑی جوشیلی مذہب پرست قوم ہے۔

۲۔ اسے ایک "آنے والے" کا انتظار ہے جس کے ہاتھوں اسلام کا غلبہ ہوگا۔ اور

۳۔ یہ غلبہ جہاد بالسیف کے ذریعے ہوگا جسے مسلمان فریضۂ خداوندی سمجھتے ہیں۔

انہوں نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لئے اس خطرہ کا دفعیہ نہایت ضروری سمجھا۔ اس سلسلے میں

اُن کے دانشوروں نے انہیں بتایا کہ مذہب کے معاملے میں مسلمان وحی سے کم کسی بات کی سند تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہوگا کہ انہیں ایک ایسا "مامور من اللہ" دے دیا جائے، جو پہلے تو غیر مسلموں کے ساتھ مناظروں سے اِن کے مذہبی جوش کی تسکین کا سامان بہم پہنچا دے اور اس کے بعد "آنے والے" کی حیثیت اختیار کرکے وحی خداوندی کی رُو سے جہاد کو حرام قرار دیدے۔ کچھ لوگ اُس کے اِن دعاوی کو قبول کر لیں گے اور باقی مسلمانوں کا مذہبی جوش خود اس کے ساتھ مناظروں کی نذر ہو جائے گا اور انہیں زندگی کے اہم معاملات کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔ علامہ اقبالؒ نے بتایا کہ یہ ہے تحریکِ احمدیت کا پس منظر۔ انہوں نے اس مسئلہ کا حل یہ پیش کیا کہ اس تحریک کے ماننے والوں کو قانون کی رو سے غیر مسلم قرار دے دیا جائے۔ یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ سنہ ۱۹۳۵ء ہی میں بہاول نگر کے ایک جج نے پرویز صاحب کے ایک مضمون کی روشنی میں یہ فیصلہ دیا کہ ایک مسلمان احمدیت کا مذہب اختیار کرنے سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں "احمدیوں" کی یہ حیثیت سنہ ۱۹۷۴ء میں جاکر قرار دی گئی۔

علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بھی محسوس کیا کہ مسلمان صدیوں سے جن سازشوں کا شکار ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اُس نظام کا احیاء کیا جائے جو قرآن کی رو سے صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا اور جس کے درخشندہ نتائج دیکھ کر ایک دنیا اس کے آغوش میں آگئی تھی۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ دنیا کی کوئی مسلمان مملکت اس نظام کو اپنے ہاں قائم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگی۔ اس کی تین وجوہات یہ تھیں:-

۱۔ مسلمان مملکتوں میں ملوکیت قائم تھی جسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں سیکولر نظام سیاست کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس نظام کی رو سے سیاسی اور تمدنی امور تو حکومت کے ہاتھ میں رہتے ہیں اور پرسنل لاز مذہبی پیشوائیت کی تفویض میں دے دیئے جاتے ہیں۔ قرآنی نظام کے قیام سے ملوکیت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

۲۔ سیکولر نظام میں اقتدار کا ایک حصّہ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں رہتا ہے اور قرآنی نظام میں اُن کا یہ اقتدار چھن جاتا ہے۔ اور

۳۔ دنیا کی کوئی غیر مسلم مملکت بھی قرآنی نظام کو برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے سیکولرازم ——— جس میں مغرب کا جمہوری نظام اور سوشلزم دونوں شامل ہیں ——— اور نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

انہوں نے عمر بھر کے غور و تدبر کے بعد یہ سوچا کہ قرآنی نظام کے احیاء کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو کوئی ایسا خطۂ زمین مل جائے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو اور وہاں قرآنی نظام کا آغاز کر دیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر پیش کیا اور اس کی وضاحت اپنے سنہ ۱۹۳۰ء کے خطبے میں کر دی۔ آپ کو کلامِ اقبالؒ میں تہذیبِ فرنگ، ملوکیت،

مارکسزم اور نظامِ سرمایہ داری کے خلاف مسلسل جہاد نظر آئے گا۔ یہ جہاد درحقیقت اس پروگرام کا حصۂ اوّل تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے قرآن کی اہمیت پر بے حد زور دیا۔ یہ اس پروگرام کا حصۂ ثانی تھا۔ وہ اس پیغام کو عام کرتے ہوئے دنیا سے تشریف لے گئے اور یہ شمع قائدِاعظمؒ کے ہاتھ میں دے گئے۔ آپ کو قائدِاعظمؒ کی تقاریر اور بیانات میں قرآنی نظام کی آواز نمایاں طور پر گونجتی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظریہ کے تسلسل میں تھا۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر وہ قوتیں جو قرآنی نظام کے قیام میں اپنی موت دیکھتی تھیں، غافل نہیں بیٹھی تھیں۔ انگریز اور ہندو دونوں کی جو متفقہ کوشش تھی کہ پاکستان وجود میں نہ آنے پائے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مسلمانوں کی مملکتوں میں ایک اور کے اضافے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی ایسی مملکت کے قیام کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، جس میں قرآنی نظام کے احیاء کا امکان ہو۔ انہوں نے پہلے نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت کرائی لیکن چونکہ وہ کانگریس کے ساتھ وابستہ ہو جانے کی وجہ سے عوام کی نگاہوں میں مطعون ہو چکے تھے اس لئے ان کی مخالفت کامیاب نہ ہو سکی۔ اس پر انہوں نے یہ سوچا کہ اس کی مخالفت کسی ایسے گوشے کی طرف سے کرائی جائے جو انگریز یا کانگرس سے وابستگی کی بنا پر بدنام نہ ہو چکا ہو۔ اس مقصد کے لئے وہ تحریک اٹھائی گئی جو جماعتِ اسلامی کے نام سے متعارف ہوئی۔ انہوں نے بھی وہی طریقِ کار اختیار کیا جو اس سے پہلے مرزا صاحب کر چکے تھے — یعنی اپنی جماعت کو مسلمان قرار دیا جائے اور باقی مسلمانوں کو غیر مسلم ٹھہرایا جائے۔ اور اس طرح تحریکِ پاکستان کے متعلق مشہور یہ کیا جائے کہ یہ مسلمانوں کی تحریک ہے ہی نہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ "مسلمانوں کا معاشرہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، تیتر، بٹیر، ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک چڑیا ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔" انہوں نے تحریکِ پاکستان کے علمبرداروں کو مخاطب کر کے کہا۔ "آپ اپنی قوم کا نام جو چاہیں تجویز فرما لیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں۔" اور کھلے الفاظ میں کہا کہ "انہیں اسلام اور اسلامی اُمت کے نام سے یہ مقدمہ (یعنی پاکستان کا مطالبہ) پیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایسا مقدمہ لے کر اٹھنے والوں کو اپنی قومیت کا کوئی دوسرا نام تجویز کرنا چاہیئے۔" (یہ تمام امور مودودی صاحب کی سیاسی کش مکش حصہ سوم میں بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔) انہوں نے دس برس تک اپنی مخالفت جاری رکھی لیکن قائدِاعظمؒ کی شخصیت اتنی بلند اور بے لوث تھی کہ ان کے سامنے ان کا چراغ جل نہ سکا۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اس سازش کا مقصود یہ تھا کہ دنیا میں کہیں قرآنی آئین و نظام نافذ نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں پہلی کوشش تو یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند کو ایسا خطۂ زمین مل ہی نہ سکے جس میں ان کی یہ آرزو بر آ سکے۔ لیکن جب اس میں انہیں ناکامی ہوئی تو پھر اس پروگرام کی

اگلی کڑی یہ سامنے آئی کہ ایسی صورت پیدا کی جائے کہ اس مملکت میں ایسا نظام قائم ہی نہ ہو سکے۔ اس مقصد کو لے کر یہ جماعت پاکستان میں آن وارد ہوئی۔

اسلامی نظام کے قیام کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ ایسا ضابطۂ آئین و قوانین مرتب کیا جائے جس کا اس مملکت میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر اطلاق ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ یہ بنیادی اینٹ صرف قرآن کریم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کتاب تو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے، لیکن فقہ اور روایات ہر فرقہ کی الگ الگ ہیں اور اگر انہیں ضابطۂ قوانین کی بنیاد قرار دے دیا جائے، یا قرآن مجید کے ساتھ انہیں بھی شامل کر دیا جائے تو پھر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر نافذ کیا جا سکے۔ مودودی صاحب کو اس حقیقت کا اچھی طرح سے علم تھا کیونکہ علامہ اقبالؒ اس کی شرح و بسط سے وضاحت کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے (مودودی صاحب نے) یہاں پہنچ کر نہایت زور و شور سے کہنا شروع کر دیا کہ مملکتِ اسلامیہ پاکستان میں آئین و قوانین کی بنیاد "کتاب و سنت" ہو گی۔ ایک طرف یہ دعوت بڑی پُرکشش اور مقدس تھی اور دوسری طرف مودودی صاحب نے اسے جس مقصد کے لئے اٹھایا تھا وہ ایسا باریک اور لطیف تھا کہ یہ سادہ لوح مسلمان اُن کے دامِ تزویر میں نہایت آسانی سے آ گیا۔ اگر علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے وہ مسلمانوں کو اس سازش سے آگاہ کرتے اور انہیں بتاتے کہ "کتاب و سنت" کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام مسلمانوں پر نافذ کیا جا سکے۔ اُن کی عدم موجودگی میں یہ فریضہ طلوعِ اسلام نے سرانجام دیا، اور، جیسا کہ ظاہر ہے، اس جماعت کی مخالفت اور فریب انگیز پروپیگنڈے کا ہدف بن گیا۔ اس کے لئے نہایت آسان طریقہ یہ تھا کہ پرویز صاحب کو ایسا شجرِ ممنوعہ بنا دیا جائے کہ کوئی ان کی آواز نہ سننا چاہے۔ چنانچہ ان کے متعلق مشہور کر دیا گیا کہ یہ منکرِ حدیث ہیں، منکرِ شانِ رسالت ہیں، ایک نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتے ہیں جس میں نو دن کے روزے اور تین دن کی نمازیں ہوں گی۔ اور نماز اُردو زبان میں پڑھی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب جھوٹ اور فریب تھا۔ چونکہ مرزا صاحب کی طرح دولت ان کی طرف بھی سیلاب کی طرح امڈی چلی آ رہی تھی اس لئے اس کے بل بوتے پر یہ پراپیگنڈا بڑے منظم طریقہ پر کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود طلوعِ اسلام اپنی اس طوطی کی آواز کو برابر بلند کرتا گیا تا آنکہ مودودی صاحب کو مجبور ہو کر ۱۹۷۰ء میں اس کا اعتراف و اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رو سے واقعی کوئی ایسا ضابطۂ قوانین نہیں بن سکتا جو تمام مسلمانوں کے لئے متفقہ طور پر قابلِ قبول ہو۔ لیکن سازش ملاحظہ ہو کہ اس کے باوجود وہ برابر پکارتے چلے جا رہے ہیں کہ یہاں کتاب و سنت کے مطابق قوانین نافذ ہونے چاہئیے۔ چنانچہ حال ہی میں اس جماعت کے زیرِ اہتمام جو وکلاء کانفرنس منعقد ہوئی ہے اس میں یہی قرارداد منظور کی گئی ہے۔ اس سے آپ ..... اندازہ لگا لیجئے کہ جس بات کو مودودی صاحب خود ناممکن سمجھتے ہیں اس پر زور

دیئے جانے کا اس کے سوا مطلب کیا ہے کہ یہاں کوئی ایسا ضابطۂ قوانین سرے سے بننے ہی نہ پائے جس کا تمام مسلمانوں پر اطلاق ہو سکے۔ یہ ہے وہ سازش جسے مودودی صاحب لے کر یہاں آئے ہیں اور جسے "اسلامی نظام" کے مقدس نام سے فروغ دیا جا رہا ہے۔ آپ سوچئے کہ صدرِ اوّل کے بعد پہلی بار ایک خطۂ زمین کے مسلمانوں کو یہ امکانی استطاعت نصیب ہوئی تھی کہ وہ قرآنی نظام کا دوبارہ احیاء کر سکیں اور اس طرح دنیا کو بتا سکیں کہ اسلام اب بھی ایک زندہ حقیقت کے طور دنیا میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس قوم ہی کی نہیں، عالمِ انسانیت کی کس قدر حرماں نصیبی ہوگی کہ یہ امکان اس سازش کی نذر ہو کر ناکام رہ جائے۔ طلوعِ اسلام اس سازش کے خلاف بہرحال اپنی آواز بلند کئے چلا جائے گا کہ یہ اسے فریضۂ خداوندی سمجھتا ہے، خواہ اس کے لئے اسے اس سازش کی طرف سے کیسی ہی شدید مخالفت کا رُخ کیوں نہ بننا پڑے۔

(۲)

جب کسی فرد یا جماعت سے کہہ دیا جائے کہ:

۱۔ زندگی کی بعض ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے تو پھر اُس جھوٹ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

۲۔ جب کسی انسان کے دل سے خدا اور اس کے رسولؐ کی شرم جاتی رہے تو اس کے لئے انسانوں سے حجاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— اور

۳۔ ملازمت برقرار رکھنے کا گُر یہ ہے کہ آپ اپنے آقا کی شان میں بھٹئی کرتے رہیں۔

ان تینوں کلیات کی شہادت امیرِ جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد صاحب کے اس تازہ خطاب سے ملتی ہے جسے انہوں نے جماعتِ اسلامی لاہور کے دفتر میں فرخابند کی تعمیر اور بنگلہ دیشوں پر بھارتی جارحیت کے خلاف منعقدہ ایک احتجاجی جلسہ میں پیش کیا۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۷ مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق:

> انہوں نے کہا کہ تین شخصیتوں نے پاکستان بنایا۔ اوّلاً علامہ اقبالؒ نے جنہوں نے الگ مملکت کا تصور دیا۔ دوم مولانا مودودی جنہوں نے نظریہ دیا اور سوم حضرت قائداعظمؒ جنہوں نے پہلے دونوں حضرات کی سوچ کو عملی شکل دی اور نظریہ اور تصور کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا۔

اقبالؒ بیچارے کو تو چھوڑ دیجئے، وہ کس باغ کی مولی ہے۔ اس نے تو صرف یہ تصور دیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی الگ مملکت بنا لینی چاہیئے۔ یعنی انہوں نے یہ قطعاً نہیں کہا کہ یہ مملکت کس نظریہ کا پیکر بنے گی۔ بس ایک مملکت ہوگی جیسی مسلمانوں کی دوسری مملکتیں ہیں۔ اقبالؒ کا یہی تصورِ مملکت تھا جس کے متعلق مودودی صاحب نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ:

ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی، افغانستان پر افغانی حکمران ہیں ... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے ... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ (ترجمان القرآن - ذی الحج ۱۳۵۹ھ)

یہ سن کر اقبالؒ میاں تو چپکے سے جانبِ عدم روانہ ہو گئے ... میاں صاحب کے بیان کے مطابق مودودی صاحب نے ایک نظریہ دیا اور کہا کہ اس نظریہ کے مطابق تشکیل کردہ مملکت اسلامی کہلائے جانے کی مستحق ہوگی۔ قائداعظمؒ نے ان سے عرض کیا کہ حضور! اگر آپ اجازت دیں تو میں اس نظریہ کے مطابق مملکت حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ انہوں نے کہا بہت اچھا۔ آپ ایسا کیجئے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے مطابق کوشش شروع کر دی۔ جب قائداعظمؒ نے ان کے نظریہ کے مطابق حصولِ مملکت کی کوشش شروع کی تھی تو ظاہر ہے کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت کو تن من دھن کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کی معاونت کرنی چاہیئے تھی لیکن انہوں نے جی بھر کر اُن کی مخالفت کی اور یہ کہہ کر مخالفت کی کہ یہ مملکت کافرانہ ہوگی، فاسقانہ ہوگی۔ یعنی انہی کے نظریہ کے مطابق جو مملکت بنے گی وہ ایسی ہوگی۔ لیکن قائداعظمؒ یہ گالیاں سنتے رہے اور ایک فاشعار ملازم کی طرح اس مملکت کے حصول کی کوشش میں منہمک رہے۔ کہہ دیا جائیگا کہ مودودی صاحب کو اس پر اختیار نہیں تھا کہ قائداعظمؒ اپنے اس عمل میں مخلص ہیں اس لئے انہوں نے شروع شروع میں اس کی مخالفت کی تھی! بہت اچھا! آیئے دیکھیں کہ جب اس مملکت کی عمارت ابھر کر سامنے آگئی تھی تو مودودی صاحب اور ان کی جماعت کا ردِ عمل کیا تھا۔ مودودی صاحب نے ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۴۶ء میں کہا تھا:-

جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ وہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آثار پاکستان (اگر فی الواقعہ وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا۔

یعنی قائداعظمؒ ان کے دیئے ہوئے نظریہ کے مطابق مملکت حاصل کر رہے تھے اور وہ عمارت اپنی آخری منزل تک پہنچ چکی تھی اور مودودی صاحب اس نظریہ کو لادینی اسٹیٹ کا نظریہ قرار دے رہے تھے! یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ ایک سال کے بعد جماعتِ اسلامی کے اُس زمانے کے ترجمان (کوثر) نے اپنی ۳۱ جنوری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں قائداعظمؒ کا مذاق ان الفاظ میں اڑایا۔

اُس زمانے میں شملہ نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنی قوموں کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمانِ رفعت پر بٹھا دیا۔ مسلمانوں نے دوسروں کو اس طرح ترقی کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے اشتہار کی عمارت بدل ڈالی۔ اب ان کے اختیارِ خیال کے صفحات پر مضمون نظر افروز یہ تھا ... ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی ... بالآخر ان کی اشتہار بازی کامیاب ہوئی اور مسٹر جناح نے اپنی درخواستِ قیادت قوم کے حضور میں گزران دی۔ قوم نے باقی سب امیدوارانِ قیادت کو برخواست کر دیا اور مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔

یہ وہ قائداعظمؒ تھے جو میاں صاحب کے بیان کی رو سے مودودی صاحب کے عطا فرمودہ نظریئے کے مطابق حصولِ مملکت کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ جنوری ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے۔ اب آگے بڑھئے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں مملکتِ پاکستان کی عمارت گویا سامنے کھڑی نظر آرہی تھی۔ ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل کو جماعتِ اسلامی کا ایک اہم جلسہ ٹونک میں منعقد ہوا۔ جس میں مودودی صاحب سے یہ

سوال کیا گیا کہ ہمیں مسلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے کہا کہ :-

جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔

مودودی صاحب نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو جماعت اسلامی کے اجتماع منعقدہ مدراس میں تحریک پاکستان پر نگاہ بازگشت ڈالتے ہوئے فرمایا :-

اگر یہ (مسلمان) قوم پرستانہ سیاست کی راہ اختیار کرنے کی بجائے اس راہ (یعنی مودودی صاحب کی تجویز کردہ راہ) کو اختیار کرتے تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا۔ لیکن میری یہ دعوت انہیں دشمنی کی دعوت یا ایک دیوانے دوست کی دعوت محسوس ہوئی۔

قائدِ اعظمؒ یہ سب کچھ سنتے رہے لیکن ایک بھوک کے ستائے محتاج مزدور کی طرح مودودی صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں اپنے کام میں جُتے رہے تا آنکہ انہوں نے اس عمارت کی تکمیل کردی اور اس کے بعد انہوں نے مودودی صاحب کے حضور عرض کیا کہ آپ کے عطا فرمودہ نظریہ کے مطابق مملکت حاصل کرلی گئی ہے۔ اس کے بعد سنیئے کہ اس مزدور کو اس آقائے نامدار کی طرف سے کیا صلہ ملا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد مودودی صاحب کے ماہنامہ ترجمان القرآن کا پہلا پرچہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا جس میں انہوں نے قائدِ اعظمؒ اور ان کے ساتھیوں کی دس سالہ محنتِ شاقہ کا جائزہ لینے کے بعد فرمایا۔

یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔

پھر اگست ۱۹۴۸ء کے ترجمان القرآن میں فرمایا :-

اس پورے گروہ میں سے ایک کوڑی بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے بٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں دکھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

یعنی مودودی صاحب نے قائدِ اعظمؒ سے کہا کہ کرتوت تو تمہارے یہ ہیں اور اس کے بعد تم ہم سے اپنی خدمات کا صلہ مانگنے آئے ہو! نکل جاؤ یہاں سے! ـــــ قائدِ اعظمؒ سر جھکائے خاموشی سے یہ سب کچھ سُن رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے چلے آئے۔ آبادیوں سے دور، زیارت کے جنگلوں میں جا چھپے اور وہاں سے پھر گیارہ ستمبر کو ان کی لاش ہی واپس آئی ــــ یہ تھے وہ قائدِ اعظمؒ جنہوں نے جناب میاں طفیل محمد صاحب کے ارشادِ گرامی کے مطابق مودودی صاحب کے عطا فرمودہ نظریہ کے مطابق پاکستان حاصل کیا تھا۔

آپ کچھ دن اور گذرنے دیجئے۔ جب ان حضرات کی مرتب کردہ تحریکِ پاکستان کی تاریخ سامنے آئے گی تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں اقبالؒ اور محمد علی جناحؒ "مرحوم" کا نام حذف ہوگا اور مملکت پاکستان کے تصور، نظریہ اور حصول کا سہرا "انہیں" "اللہ کے شاہکار" مودودی صاحب کے سر بندھا دکھائی دے گا ــــ یوں تاریخ مرتب ہوا کرتی ہے۔

(ہم نے یہ سطور، دل پہ پتھر رکھ کر حکیم الامت علامہ اقبالؒ اور محسنِ ملت قائدِ اعظمؒ کی روح، اور خود ملتِ اسلامیہ سے ہزار ہزار معذرت کے ساتھ قلمبند کی ہیں۔ اس معذرت کے بعد ہم اس سے زیادہ اور کیا عرض کریں کہ ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف ۔۔۔ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہم نے یہ دن دیکھنے تھے اور یہ کچھ بھی سننا تھا ـــــ مرا اے کاشکے، مادر نزادے!)

تتمۂ خطاب

"متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی"

(یہ خطاب طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا)

اس خطاب کے سلسلے میں بعض حضرات نے کچھ سوالات دریافت کئے اور بعض نے اس کے چند ایک نکات کی وضاحت چاہی۔ میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اُن کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ لہٰذا اس وضاحت کو اس "تتمہ" کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔

سوال (۱):۔ آپ نے کہا ہے کہ تھیاکریسی کی بدترین شکل انفرادی آمریت ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے مرزا غلام احمد اور مودودی صاحب کو ایک ہی پلڑے میں رکھا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔

جواب:۔ میں نے مرزا صاحب اور مودودی صاحب کو ایک ہی پلڑے میں نہیں رکھا۔ جہاں تک ان کے دعاوی کا تعلق ہے ان کا پلڑا بے شک ایک ہی ہے۔ لیکن جہاں تک ان کی تحریکوں کا تعلق ہے، مودودی صاحب کی تحریک، تحریکِ "احمدیت" سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

آپ پہلے انفرادی آمریت کو لیجئے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے رشد و ہدایت کا سلسلہ اس طرح سے رہا کہ ایک رسول آتا۔ لوگوں تک دینِ خداوندی پہنچاتا اور اپنے دائرے کے اندر اُسے قائم بھی کر دیتا۔ ازاں بعد جب وہ دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تو پھر ایک اور نبی آ جاتا، اور وہ اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعے مذہب کو دین میں بدل دیتا۔ یہ سلسلہ انفرادی تھا۔ یعنی یہ فریضہ ایک فرد سرانجام دیتا تھا، جسے نبی یا رسول کہا جاتا تھا۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر پہنچنے کے بعد مشیتِ خداوندی نے اپنے اس پروگرام میں تبدیلی کی۔ افراد کا سلسلہ ختم کر دیا اور اس کی جگہ نظام نے لے لی۔ یہی ختمِ نبوت کی اصل و اساس اور لم اور غایت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تبدیلی خود نوعِ انسان کی تاریخ میں ایک بہت بڑے انقلاب کا آغاز تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے تشریف براری کے بعد یہ نظام بدستور قائم رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود اس کی طرح یا بنیاد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے رکھوا دی گئی تھی۔ جہاں تک وحیٔ خداوندی کا تعلق تھا اس میں نہ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی فکر کا کوئی دخل تھا، اور نہ ہی کسی سے کوئی مشورہ لینے کا سوال۔ لیکن جہاں تک وحیٔ خداوندی کی رو سے عملی نظام کا

تعلق تھا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) "تم، معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو" اسی حکم کی پابندی جانشینانِ رسولؐ کے لئے بھی لازم قرار دی گئی اور ان کے متعلق کہا گیا، وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔" لہذا اس نظام میں، جہاں تک وحی کا تعلق تھا، وہ قرآن کریم کی شکل میں موجود تھی اور جہاں تک، نظام کے عملی مسائل کا تعلق تھا اس کے لئے اُمت کے باہمی مشورہ کا حکم تھا۔ لہذا اس نظام میں، فرد کی دینی حیثیت کچھ نہیں تھی۔ خود خلیفۃ الرسولؐ کی طرف سے جو احکام و قوانین نافذ ہوتے تھے وہ بھی اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی حیثیت سے ہوتے تھے۔ اس فرد کی ذاتی حیثیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ نہ وہ مامور من اللہ ہوتا تھا اور نہ ہی دین میں سند قرار پاتا تھا۔

جب اس نظام کا سلسلہ منتشر ہوا تو دین کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اس مذہب میں اگرچہ مختلف فرقوں کی نسبت مختلف ائمہ (افراد) کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن ان ائمہ میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ دین میں سند میری ذات ہے۔ یہ دعویٰ مرزا غلام احمد نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام وہی اسلام ہے جسے میں اسلام قرار دے دوں۔ جو لوگ اس اسلام کو اسلام مانیں، وہ مسلمان ہیں۔ جو ایسا نہ مانیں وہ مسلمان نہیں، خواہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتے رہیں۔ (ان امور کی تفصیل میری کتاب ختم نبوت اور تحریک احمدیت میں ملے گی) مرزا صاحب نے کہا کہ اتباعِ محمدیہ سے میں

میرزا غلام احمد اور مودودی صاحب

اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں روحِ محمدی میرے اندر حلول کر چکی ہے۔ اس لئے میں رسول اللہ کا ظل اور بروز ہوں۔ چنانچہ (جیسا کہ میں نے خطاب میں کہا ہے) انہوں نے کہا کہ رسول اللہ کی احادیث میں سے جسے میں صحیح قرار دوں اُسے صحیح سمجھا جائے، جسے میں مسترد کر دوں، اُسے مسترد کر دیا جائے۔ بعینہٖ یہی پوزیشن مودودی صاحب نے اختیار کی اور احادیث کے سلسلے میں کہا:۔

> جس شخص کو اللہ تعالےٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے .... جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان میں کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنتِ نبویہ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روحِ محمدی میں

گم، اور اس کی بصیرت، بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔

(تفہیمات حصہ اوّل)

آپ غور کیجئے کہ کیا مرزا صاحب کے دعویٰ اور مودودی صاحب کی اس حیثیت میں کوئی فرق ہے؟ فرق اتنا ہی ہے کہ مرزا صاحب نے کھلے الفاظ میں دعویٰ کر دیا اور مودودی صاحب نے اس کی احتیاط برتی۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ کھلے طور پر دعویٰ کا اعلان کرنے کے خلاف جمہور مسلمانوں کا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔

جس طرح مرزا صاحب نے موجودہ مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا ـــــ ایک وہ، جو اُن کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیں اور دوسرے وہ، جو اُن کے اس دعویٰ کا انکار کر دیں۔ انہیں وہ دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔ مودودی صاحب نے بھی مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی موجودہ مسلمانوں کو انہوں نے "پیدائشی مسلمان" قرار دیا اور کھلے بندوں کہہ دیا کہ:-

> ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ (ترجمان القرآن - ذوالحج ۱۳۵۹ھ صفحہ ۱۵۴)

ان کے برعکس، کھرے، سچے اور سکہ بند مسلمان انہیں قرار دیا جو ان "پیدائشی مسلمانوں" میں سے تجدیدِ ایمان کے بعد ان کی جماعت میں شامل ہو جائیں۔

جماعتِ اسلامی میں داخلہ کی شرط

انہوں نے اپنے خطاب میں بتایا ہے کہ انہوں نے اگست ۱۹۴۱ء میں اپنی جماعت کی بنیاد رکھی۔ وضاحت کے طور پر یہ سن لیجئے کہ انہوں نے اس جماعت میں داخل ہونے کے لئے شرط کیا قرار دی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا:-

> جماعتِ اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا .... اس دائرے میں آنے کے لئے شرطِ لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو[1] .... اور اس کے بعد اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمد الرسول اللہ کہنے کی جرأت کرے۔ صرف وہی جماعتِ اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے خواہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سرِ نو ایمان لائے۔ (ترجمان القرآن - محرم سنہ ۱۳۶۱ھ صفحہ ۴۰)

میرزا غلام احمد نے بھی کوئی نیا کلمہ وضع نہیں کیا تھا۔ نہ ہی انہوں نے نماز، روزہ یا پرسنل لاز میں کوئی

---

[1] واضح رہے کہ جو لوگ اس طرح جماعت میں داخل ہوئے تھے وہ پڑھے لکھے تھے اور کلمۂ شہادت کے معانی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ (ان میں بعض دین کے عالم بھی تھے) ان سے بھی تجدیدِ ایمان کرائی گئی تھی۔ (طلوعِ اسلام)

تبدیلی کی تھی۔ لیکن مسلمان وہ انہی کو سمجھتے تھے جو ان کی جماعت میں داخل ہوں۔ بعینہٖ یہی پوزیشن مودودی صاحب نے اختیار کی۔ اور اپنی جماعت کا نام "جماعت اسلامی" رکھا۔ اِس جماعت میں داخل ہونے والوں کے متعلق اتنا ہی نہیں کہا کہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہیں، یہ بھی کہا کہ ملک میں سب سے قابلِ اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگ ہیں انہیں اِس جماعت میں منظم کر لیا گیا ہے۔ (بحوالہ اعتصام بابت ۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء) اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا:۔

> اِس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی۔ (سیاسی کش مکش حصہ سوم)

سوال (۲):۔ آپ نے کہا ہے کہ جب مودودی صاحب حیدرآباد (دکن) سے پنجاب کی طرف آئے ہیں تو آپ نے اِن کے دماغ میں ان جراثیم کو بھانپ لیا تھا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ انہوں نے اِسے عملی شکل کب دی تھی؟

جواب:۔ وہ جب (۱۹۳۷ء کے اواخر یا شاید ۱۹۳۸ء کے شروع میں) پٹھانکوٹ گئے ہیں تو اس وقت علامہ اقبالؒ حیات تھے۔ اُن کی زندگی میں مودودی صاحب اس قسم کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

جماعت سازی ممنوع ہے

اِس کے برعکس، انہوں نے اس وقت اعلان کیا تھا کہ اسلام کی رو سے اُمت کے اندر کوئی الگ جماعت بنانا جائز نہیں۔ انہوں نے فروری ۱۹۳۸ء میں، ماہنامہ "پیغامِ حق" میں اپنا ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ:۔

> یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لئے ہیں مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آ سکتیں۔

(ضمناً) اس زمانے میں خاکساروں کی تنظیم ایک موثر جمعیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ مودودی صاحب کے مقالہ میں "وردی" یا "ظاہری علامت" سے خاکساروں کی طرف اشارہ تھا۔ علامہ مشرقی (مرحوم) کو آپ جانتے ہیں، وہ کسی کو بخشنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار "الاصلاح" میں مودودی صاحب کو سخت ڈانٹ پلائی، جس کا عنوان تھا:۔

پٹھان کوٹ میں مذہبی بدمعاشی کا نیا اڈہ

بہرحال مودودی صاحب نے علامہ اقبالؒ کی زندگی میں تو اس کی جرأت نہ کی، لیکن (ان کی خوش قسمتی اور قوم کی بدنصیبی کہ) حضرتِ علامہ کا انتقال دو ہی ماہ بعد (اپریل ۱۹۳۸ء میں) ہو گیا اور اس کے بعد انہوں نے اپنے پروگرام کی طرح ڈالنی شروع کر دی۔ میں نے اپنے خطاب میں بتایا ہے کہ قائدِاعظمؒ جہاں یہ کہتے تھے کہ مطالبۂ پاکستان کا مقصد ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول ہے جس میں قرآنی نظام قائم کیا جائے، اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی کئے جاتے تھے کہ اس مملکت میں تھیاکریسی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ (مثلاً) جب وہ (۱۹۴۱ء میں) حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے تو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا کے اس سوال کے

تھیاکریسی کے خلاف

جواب میں (کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں) فرمایا:-

جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیرمسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

اس کے بعد طلبا کی طرف سے پوچھا گیا:-

جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریقِ کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہ وہاں اپنے ذہنی میلانات اور تصوراتِ زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لا سکیں تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جد و جہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟

سوال آپ نے سن لیا۔ اب قائدِاعظمؒ کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ انہوں نے کہا:-

دقت یہ ہے کہ جب اس جد و جہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت، بلا اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیمِ عمل اور اس کے

اصلی حدود کیا ہیں، اِن امور کو چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے، اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اِس منصب کی بجاآوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے انہیں مَیں ان مولوی صاحبان میں (اِلّا ماشاء اللہ) نہیں پاتا (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اِس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

اِسی حقیقت کی انہوں نے، قیامِ پاکستان کے بعد، اہلِ امریکہ کے نام اپنے ایک براڈ کاسٹ میں (فروری ۱۹۴۸ء میں) اِن الفاظ میں وضاحت کر دی کہ:-

کچھ بھی ہو۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیا کریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل ص۶۵)

یہ تھی وہ دارننگ، جس سے مودودی صاحب نے سمجھ لیا کہ مجوزہ پاکستان میں، اقتدار میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اِس سے انہوں نے قائدِاعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔ اس سلسلے میں طلوعِ اسلام میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ دو ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مودودی صاحب نے لکھا کہ:-

افسوس کہ لیگ کے قائدِاعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو ..... اِن کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خورد بین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔

تحریکِ پاکستان کے متعلق کہا کہ:-

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔

یہ تمام عبارتیں اِن کی کتاب ـــــ سیاسی کش مکش حصہ سوم ـــــ میں موجود ہیں۔

اس تحریک کے حاصل کو کافرانہ اور اس کی قیادت کو فاسقانہ اور فاجرانہ کیوں قرار دیا جا رہا تھا؟ محض اس لئے کہ نہ یہ تحریک اِن کی جماعت کی پیدا کردہ تھی اور نہ ہی اِس کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اسی لئے وہ کہتے تھے کہ:-

مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ سوال میرے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کرایا جائے..... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے..... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ (ایضاً)

انہیں مجوزہ پاکستان میں دلچسپی اس لئے نہیں تھی کہ اس میں زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں نہیں رہنی تھی۔

سوال (۳):۔ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اس زمانے میں کی تھی جب یہ واضح نہیں تھا کہ پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے "سیاسی کش مکش" حصہ سوم میں کہا تھا کہ:۔

اس موقعہ پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

مودودی صاحب کو سب کچھ معلوم تھا

اسی بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ "میرے نزدیک جو سوال سب سے اہم اور اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظامِ حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریۂ جمہوریت کے مطابق "عوام کی حاکمیت پر۔ اگر یہ بات واضح ہوتی تو وہ کبھی اس کی مخالفت نہ کرتے۔

جواب:۔ جماعتِ اسلامی کی طرف سے یہ بات اکثر دہرائی جاتی ہے اور یہ کذب بافی اور مغالطہ آفرینی کی بدترین مثال ہے۔ یہ شوشہ بھی مودودی صاحب ہی کا چھوڑا ہوا ہے۔ جنوری ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ مسٹر بھٹو نے کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران، مودودی صاحب کی کتاب "مسلمان اور سیاسی کش مکش، حصہ سوم" سے وہ اقتباسات پڑھ کر سنائے جن میں پاکستان کی مخالفت اور قائدِ اعظمؒ کی شان میں گستاخیاں کی گئی تھیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے ایک بیان دیا جس میں کہا کہ:۔

اس کتاب کے مضامین ۱۹۳۹-۴۰ء میں لکھے گئے تھے جب ہنوز قرار دادِ پاکستان منظور نہیں ہوئی تھی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کو ایک قومی ریاست کی بجائے اسلامی ریاست کے نصب العین کی طرف موڑ دیا جائے۔

(روزنامہ امروز و مشرق۔ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۰ء)

آپ دیکھئے کہ اس میں کس چابکدستی سے مغالطہ آفرینی اور فریب دہی کی کوشش کی گئی ہے۔ "سیاسی کش مکش" کے موضوع پر مقالات کا یہ سلسلہ بے شک ۱۹۳۹ء سے شروع ہوا ہوگا۔ لیکن تحریکِ پاکستان اور قائدِ اعظمؒ

کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" کی فروری ۱۹۴۱ء و مارچ ۱۹۴۱ء کی اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ یعنی قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے ایک سال بعد۔ بعد میں یہ مضامین، کتابی شکل میں بھی شائع کئے گئے اور قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے خلاف مقالات اس کی تیسری جلد میں شامل کئے گئے .... اس جلد پر یہ تو نہیں لکھا گیا کہ وہ کب شائع ہوئی تھی لیکن اس میں جماعتِ اسلامی کے پہلے اجتماع کا ذکر موجود ہے۔ جو اگست ۱۹۴۱ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس شہادت سے واضح ہے کہ یہ کتاب، کم از کم اگست ۱۹۴۱ء کے بعد شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے ہیں لیکن کسی میں ان باتوں کی تردید نہیں کی گئی جو تحریکِ پاکستان اور قائداعظمؒ کی مخالفت میں کہی گئی تھیں۔

لیکن یہ بات (کہ مودودی صاحب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مطالبۂ پاکستان ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول ہے جس میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کیا جائے گا۔) اس سے بھی بہت پہلے کی ہے۔ خود انہی سے سنئیے۔ جماعتِ اسلامی کے ترجمان ــــ ایشیا ــــ کے ۲۵ اگست ۱۹۶۸ء کے اداریہ میں غیرمنقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی مختلف تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ:-

> ۱۹۳۶ء تک یہی حالت رہی۔ لیکن فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ کی پکار کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ان سب سیاسی نصب العینوں سے مایوس ہو کر یہ محسوس کرتے لگے کہ ان کی نجات اسلام میں ہے .... مسلم لیگ نے اس نصب العین کو اپنا لیا ہے۔ اس کے لیڈروں نے ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کی اور دیکھتے دیکھتے پوری مسلمان قوم اس کے علم تلے جمع ہو گئی۔

اس سے واضح ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے مسلمانانِ ہند نے ایک اسلامی مملکت کا نصب العین اپنے سامنے رکھ لیا تھا اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے اِسے اپنا کر ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کر دی تھی۔

یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھیئے۔ مودودی صاحب نے ۱۹۷۰ء میں لاہور میں منعقد اقبالؒ ڈے میں شرکت کی (جہاں تک مجھے معلوم ہے انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد پہلی دفعہ ایسا کیا تھا اور یہ شاید اس لئے کہ اس وقت الیکشن قریب آ رہے تھے) بہرحال، اس تقریب میں انہوں نے اپنی تقریر میں کہا:-

> اقبالؒ نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔ اقبالؒ نے آپ کو نظریہ دیا اور قائداعظمؒ نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔
> (ایشیا۔ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء)

علامہ اقبالؒ کی وفات اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ لہٰذا ان کی مذکورہ بالا وضاحت بہرحال اس سے

پہلے کی بات ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کو کم از کم ابتداء ۱۹۳۸ء میں اس کا علم تھا کہ مطالبۂ پاکستان سے کیا مقصود تھا ــــ اور "سیاسی کش مکش" کا سلسلۂ مضامین (بقول مودودی صاحب) اس کے بعد شروع کیا گیا تھا۔ اور آگے بڑھئے۔ نوائے وقت کی گیارہ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں، ایک رنگین چوکھٹے میں، مودودی صاحب کا ایک بیان شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ :-

> قائدِاعظمؒ کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت، بقا اور نشو و نما کا اصل سرچشمہ اسلام ہے۔ اِس لئے انہوں نے بار بار اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں، اسلامی جمہوری نظام قائم کیا جائے گا۔

ایشیا کی ۲۰ر اگست ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا ایک بیان شائع ہوا، جس میں انہوں نے کہا کہ :-

> اگر تحریکِ پاکستان کے آغاز میں یہ نہ کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے بنانا مطلوب ہے تو اس تحریک کو کبھی مسلمانوں کی تائید حاصل نہ ہوتی اور نہ ہی یہ ملک وجود میں آتا۔

خود، مودودی صاحب کے رسالہ ــــ ترجمان القرآن ــــ کی جون ۱۹۶۵ء کی اشاعت کے "اشارات" اِن الفاظ سے شروع ہوتے ہیں :-

> برِعظیم ہند کے سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں باشندے اور پوری دنیا کا پریس اس حقیقت پر گواہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے پیچھے نہ تو کوئی سیاسی غرض کارفرما تھی اور نہ معاشی مصلحت ــــ اس کا محرک صرف ایک ہی جذبہ تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسا الگ خطۂ ارض مل جائے جس میں وہ بڑی آزادی کے ساتھ اسلامی نظامِ حیات نافذ کر سکیں۔

ذرا آگے چل کر لکھا ہے :-

> یہ امر اپنی جگہ مسلّم ہے کہ نظریۂ پاکستان کے بانی اور تحریکِ پاکستان کے قائد ہر موقعہ پر مسلمانوں کو یہی کہتے رہے کہ اِس ملک کے قیام کا مقصد بجز اِس کے اور کچھ نہیں کہ یہاں اسلام کی ایک ایسی تجربہ گاہ قائم کی جائے جس سے مادی تہذیب سے ستائی ہوئی انسانیت آرام اور سکون حاصل کر سکے۔

آپ مودودی صاحب کے اِن بیانات کو دیکھئے جن میں کہا گیا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے آغاز سے آخر تک اس کے قائدین واضح الفاظ میں یہ کہتے رہے اور بار بار کہتے رہے کہ اس تحریک اور مطالبہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس قطعۂ زمین میں اسلامی نظام قائم کیا جا سکے ــــ اور اس کے مقابلے میں مودودی صاحب ہی کا، ۱۹۴۱ء کا یہ بیان دیکھئے کہ "لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں یہ بات آج تک واضح

نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔" اس کے ساتھ ہو مودودی صاحب کا یہ بیان کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اس زمانے میں کی تھی جب ہنوز لیگ کی سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد منظور نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُس قرارداد کے پاس ہونے کے بعد انہوں نے اسے غیر اسلامی تحریک کہہ کر اس کی مخالفت نہیں کی تھی لیکن اس کا کیا جواب کہ ان کی مخالفت کا یہ سلسلہ تشکیلِ پاکستان تک جاری رہا۔ ۲۶/۲۷ اپریل سنہ ۱۹۴۷ء کو (یعنی قیامِ پاکستان سے کوئی چار مہینے، اور اعلانِ پاکستان سے صرف دو مہینے پہلے) ٹونک میں اسلامی جماعت کا ایک اہم جلسہ ہوا جس میں مودودی صاحب سے مسلم لیگ کے بارے میں سوالات پوچھے گئے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ:-

> اسے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے ....
>
> جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اُس کا ساتھ دے۔

(ترجمان القرآن۔ جلد نمبر ۳۰۔ عدد ۶۔ بحوالہ جماعتِ اسلامی پر ایک نظر صفحہ ۴۳)

سوال (۴) :- جب مودودی صاحب تحریکِ پاکستان کے آغاز سے لے کر اس کے آخری مرحلے تک اُسے غیر اسلامی قرار دیتے رہے تو پاکستان آنے کے بعد وہ بار بار کیوں کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی نظام قائم ہو؟

جواب:- اس سوال کا جواب ظاہر ہے۔ مودودی صاحب کی اس زمانے میں ساری کوشش یہ تھی کہ لوگ قائدِ اعظمؒ سے منحرف ہو کر انہیں اپنا قائد تسلیم کر لیں اور مسلم لیگ کی بجائے ان کی جماعت کا ساتھ دیں۔ اس کے لئے یہ کہا گیا کہ مسلم لیگ کی تحریک غیر اسلامی ہے اور اس کی قیادت میں اسلامی ذہنیت کا چھینٹا تک نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس اسلام کے واحد اجارہ دار ہم ہیں۔ جب یہ اس مقصد میں ناکام رہے اور پاکستان بن گیا تو انہوں نے یہاں آتے ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو۔ اور تم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اسلامی نظام کی الف۔ب سے بھی واقف ہو۔ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے، یہ ہم جانتے ہیں۔ اس لئے تمام اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو تاکہ ہم وہ مقصد پورا کر دکھائیں جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سنہ ۴۹-۱۹۴۸ء سے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ:-

اب اسلام، اسلام کیوں؟

> کسی قوم اور ملک کی انتہائی بدقسمتی یہی ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت اس کے اقتدار پر قابض ہو جائے .... ایسے حالات میں غیر صالح قیادت کو ایک منٹ کے لئے بھی گوارا کرنا خلافِ مصلحت ہے۔ ایک غلط قیادت کی بقا کے لئے اس طرح کی کوشش کرنا ملک اور قوم کے ساتھ، سب سے بڑی غداری، اور غلط قیادت سے نجات دلانے کی کوشش کرنا، اس کی سب سے بڑی

خیر خواہی ہے (ترجمان القرآن - جون جولائی ۱۹۴۹ء)

یہ ہے مقصد مودودی صاحب کے سامنے پاکستان بننے کے بعد۔ اور یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے انہوں نے اس بدنصیب ملک میں ایک دن بھی ایسا نہیں آنے دیا کہ لوگ اطمینان کا سانس لے سکیں۔ اور یہ یہی کچھ کرتے رہیں گے جب تک اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ آ جائے۔ جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آ جائے گا تو "پیدائشی مسلمانوں" کا کیا حشر ہوگا۔ اس کے لئے ان کا کتابچہ ——— مرتد کی سزا ——— ملاحظہ کیجئے جس میں واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے کہ انہیں ایک سال کا نوٹس دیا جائے گا اور اگر وہ اس دوران میں ان کا مقرر کردہ اسلام قبول نہیں کریں گے تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔

سوال (۵):- آپ نے کہا ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے مودودی صاحب کو لکھا کہ وہ "خود مرکزیت" کے خناس کو اپنے دماغ سے نکال دیں۔ مودودی صاحب کی طرف سے اس کا کوئی جواب دیا گیا.....؟

گالیاں

جواب:- جی ہاں! جواب دیا گیا۔ یعنی حسبِ معمول گالیوں کی بوچھاڑ۔ مودودی صاحب کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو خود گالیاں نہیں دیتے۔ خود تو خاموش رہتے ہیں اور اپنے مصاحبوں سے انہیں گالیاں دلواتے رہتے ہیں۔ اس سے (حقیقت سے بے خبر) لوگ یہ تاثر لیتے ہیں کہ دیکھئے! مودودی صاحب کس قدر بلند ظرف کے انسان ہیں کہ مخالفین ہزار کچھ کہیں، یہ کبھی زبان درازی نہیں کرتے۔ ان کی جماعت سے جو حضرات ۱۹۵۶ء میں الگ ہوئے تھے اور جن کے سرخیل مولانا اصلاحی تھے۔ ان کی شان میں، اس جماعت کے لٹریچر میں جو کچھ کہا گیا وہ درکنار رہا۔ (مولانا) عبدالرحیم اشرف نے اپنے جریدہ "المنبر" کی اشاعت بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا کہ خود مودودی صاحب ان اختلاف کرنے والوں کو یہ کچھ ثابت کرتے رہے۔

> نجوی کے مرتکب۔ ضعف ارادہ و نفرت کے مریض۔ یک رُخے۔ تحریکِ اسلامی کے نادان دوست۔ جماعت کے غدار۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کے روڑے۔ خدا کے خوف سے عاری۔ خائن۔ انتشار پسند۔

سوال (۶):- آپ نے کہا ہے کہ جماعتِ اسلامی والے، مودودی صاحب کو اسلام میں سند سمجھتے ہیں۔ اس کی کوئی عملی مثال دیں گے؟

جواب:- اس کی عملی مثال تو اس جماعت کی ساری تاریخ ہے۔ آپ اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے کہ مودودی صاحب نے کسی مسئلہ کے متعلق یہ کہا ہو کہ وہ اسلام کے مطابق ہے اس کے خلاف ہے اور ان کی جماعت کے کسی رکن نے اس سے اختلاف کیا ہو۔ مودودی صاحب نے کہا کہ

۱؎ اگرچہ بعض اوقات مغلوب الغضب ہو کر یہ بھی کچھ کمی نہیں کرتے لیکن بالعموم یہ خود خاموش رہتے ہیں۔

انتخابات میں حصہ لینا اسلام کی رو سے قطعاً جائز نہیں، تو ان کے متبعین نے کہا کہ آمنّا و صدّقنا۔

دین میں سند

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ انتخابات میں حصہ لینا عین مطابقِ 'اسلام' ہے اور جماعت والوں نے کہا کہ بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ مودودی صاحب نے کہا کہ اسلام کی رو سے عورت کو ووٹ دینے تک کا بھی حق حاصل نہیں اور ان کے معتقدین نے کہا۔ کہ بالکل درست۔ پھر انہوں نے کہا محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) منصبِ صدارت کی امیدوار ہیں ان کی مدد کرنا عین تقاضائے اسلام ہے۔ جماعت نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ مودودی صاحب نے کہا کہ زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حدبندی قطعاً اسلام کے خلاف ہے۔ جماعت نے کہا۔ بالکل بجا ارشاد ہوا۔ پھر انہوں نے کہا کہ ملکیتِ اراضی کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہونی چاہئے، اور جماعت نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ "نیشنلائزیشن" کا نظریہ ابلیس کی ایجاد ہے۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ جماعت نے کہا، بالکل بجا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ کلیدی صنعتیں قومیائی جا سکتی ہیں۔ جماعت نے کہا 'بالکل درست'۔

غرضیکہ کہاں تک مثالیں پیش کی جائیں۔ اس جماعت کے نزدیک اسلام ہے ہی وہی، جسے مودودی صاحب اسلام قرار دے دیں۔

سوال (۷):۔ جب رسول اللہ کی احادیث کے مجموعے مرتب کر لئے گئے تو پھر ان کی رو سے اطاعتِ رسول اللہ کیوں نہیں کی جا سکتی۔ اس میں کیا حرج واقع ہوتا ہے؟

جواب:۔ حرج تو بالکل واضح ہے۔ امت میں جس قدر فرقے پائے جاتے ہیں وہ سب اپنے اپنے مسلک کی تائید میں احادیثِ رسول اللہ پیش کرتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جو یہ فیصلہ کر سکے کہ کونسا مسلک سنتِ رسول اللہ کے مطابق ہے۔

احادیث کی اطاعت

خلفائے راشدین کے زمانے میں ارشاداتِ رسول اللہ موجود تھے۔ (اگرچہ وہ مرتب شکل میں نہیں تھے) اس وقت ان ارشادات (احادیث) کی بنا پر کوئی فرقہ وجود میں نہیں آیا تھا کیونکہ زندہ سنٹرل اتھارٹی موجود تھی۔ جب یہ نہ رہی تو مختلف گروہ اپنے اپنے طور پر فیصلہ کرنے لگ گئے۔ اس طرح اُمت فرقوں میں بٹ گئی۔ امت کا یہ تفرقہ مٹ نہیں سکتا جب تک اس سنٹرل اتھارٹی (خلافت علیٰ منہاج نبوت کے نظام) کو پھر سے قائم نہ کر لیا جائے۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ خدا کی کتاب کے ساتھ رسول کی بعثت کی ضرورت یہ تھی کہ تنہا کتاب کی اطاعت ممکن نہیں تھی۔ آپ سوچئے کہ جب زندہ اتھارٹی کے بغیر خدا کی کتاب پر عمل ممکن نہیں تھا تو اس اتھارٹی کے بغیر احادیث کی کتابوں پر عمل کس طرح ممکن ہے؟ اس اتھارٹی کے نہ ہونے سے کتاب اللہ اور احادیثِ رسول اللہ کے باوجود اُمت کی وحدت ختم ہو گئی اور جب اُمت کی وحدت ختم ہو گئی تو دین باقی نہ رہا۔

سوال (۸) :- کیا آپ کے نزدیک خلافتِ راشدہ کے منہج کا اسلامی نظام پھر سے قائم ہو سکتا ہے؟

جواب :- اگر اِس نظام (یعنی دین) کا قیام ممکن نہ ہوتا تو قرآن مجید کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا فائدہ کیا تھا؟ علاوہ بریں خدا کا فیصلہ ہے کہ دینِ خداوندی تمام نظام ہائے عالم پر غالب آ کر رہے گا۔ (لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ) اگر اِس نظام کا احیاء ممکن نہیں تو پھر خدا کا یہ وعدہ پورا کس طرح ہو گا؟ یہ نظام قائم ہو گا اور تمام نظام ہائے عالم پر غالب آ کر رہے گا کہ: إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۳/۹) "خدا کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا"۔

خلافتِ راشدہ کا احیاء

سوال (۹) :- جب آپ بھی یہ کہتے ہیں کہ اس وقت اسلام مذہب نہیں، دین ہے اور مسلمان دین پر کاربند نہیں ——— اور مودودی صاحب بھی یہی کہتے ہیں تو پھر آپ دونوں میں فرق کیا ہے اور آپ، ان کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

جواب :- مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ موجودہ اسلام دین نہیں مذہب ہے۔ دین اس اسلام کو سمجھا جائے گا جسے وہ اسلام کہہ دیں ——— اور میں یہ کہتا ہوں کہ ختمِ نبوت کے بعد کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسلام میں سند بن بیٹھے، میرا اپنا کوئی دعویٰ نہیں۔ نہ میری کوئی پارٹی، جماعت یا فرقہ ہے۔ نہ میں کسی جماعت کا امیر یا فرقے کا امام ہوں۔ میری حیثیت قرآن کریم کے ایک طالب علم اور مبلغ کی ہے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ اِس فکر کو عام کرتے جائیں کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ نظامِ حیات ہے، جس کے لئے ایک مملکت کی ضرورت ہے۔ اس مملکت کا جملہ کاروبار، قوانین و احکامِ خداوندی کی چار دیواری میں رہتے ہوئے سرانجام پائے گا۔ اس میں اربابِ اقتدار وہ ہوں گے جن کی سیرت، سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہو گی۔ قرآن، حدیث، فقہ، سب ان کے سامنے ہوں گے۔ اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی یا مرکزِ ملت کی وساطت سے اس کے فیصلے قانونی حیثیت سے نافذ ہوں گے اور ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو گا۔ یہ سارا نظام اُمت کے مشورے سے طے پائے گا اور اس میں کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہو گا کہ وہ اسلام میں سند بن بیٹھے اور اس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائم مقام بن جائے۔ میں اس قسم کے نظام کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہوں۔ باقی رہے اس وقت کے مسلمان، تو جیسے کچھ وہ ہیں، ویسے ہی ہم ہیں۔ جو حالت اُن کی، وہی ہماری۔ یہ حق تو ایک رسولؐ ہی کو پہنچتا تھا کہ وہ آ کر کہے کہ تم سب دین سے منحرف ہو۔ دین لے کر میں آیا ہوں۔ جو میری بات مانے گا وہ دین کا پیرو کہلائے گا، جو اسے تسلیم نہیں کرے گا اسے دین سے کوئی واسطہ نہیں ہو گا۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا کہنے والا ختمِ نبوت کی مہر کو توڑ دیتا ہے خواہ وہ "مرزا غلام احمد" ہو یا "سید ابوالاعلیٰ مودودی"، جنہیں ان کے متبعین "اللہ کا شاہکار" قرار دیتے ہیں۔ میں تو اس کے تصور تک سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے جسے سادہ لوح مسلمان پہچانتا نہیں۔

سوال (۱۰): جماعت اسلامی کے زیر اہتمام حال ہی میں ملک بھر کے ماہرین قانون، وکلا صاحبان کا ایک بہت بڑا کنونشن بدیں غرض منعقد ہوا ہے کہ ملک میں قانون شریعت کا نفاذ ہو۔ ان سے کہا گیا ہے کہ قانون شریعت مدون کریں اور یہ بتائیں کہ اس کے نفاذ کی عملی شکل کیا ہونی چاہیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ جماعت (یعنی مودودی صاحب) قانون شریعت کی تدوین اور نفاذ کے خواہش مند بھی ہیں اور اس کے لئے کوشاں بھی۔

جواب: میں نے اس کنونشن کی کارروائی اخبارات میں پڑھی ہے اور اس بات کا مجھے بے حد افسوس ہوا ہے۔ افسوس جماعت اسلامی پر نہیں کیونکہ یہ تو ان کے پروپیگنڈا کی ایک کڑی ہے۔ افسوس وکلاء حضرات پر ہے جو کنونشن میں شریک ہوئے۔ ہماری قوم کے عوام سادہ لوح بھی ہیں اور جذباتی بھی۔ لیکن قوم کے دانشور طبقہ سے کم از کم یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ معاملات پر جذبات سے الگ ہٹ کر حقائق و واقعات کی روشنی میں غور و فکر کریں۔ اس میں وکلاء حضرات کا نام سر فہرست آتا ہے۔ کیونکہ ان کا اوڑھنا بچھونا قانون ہوتا ہے اور قانون میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر یہ طبقہ بھی عوام کی سطح پر اتر آئے تو اس سے بڑھ کر مقام تاسف اور کونسا ہو سکتا ہے؟

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ کنونشن اس جماعت کی طرف سے منعقد کیا گیا جس کا بانی، وکالت کے پیشہ ہی کو حرام قرار دیتا ہے۔ مودودی صاحب نے ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں کہا تھا۔

> وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانون الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہرحال وہ بغاوت نہیں تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے۔ اور کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں جس درجہ میں کہ یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے .... وکیل کے محرر کا کام بھی حرام ہے .... وکلا کے ہاں کے کھانا کھانے میں بھی پرہیز اولیٰ ہے۔ (ترجمان القرآن - جنوری فروری ۱۹۴۵ء)

مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ وکلا حضرات کے اس جم غفیر میں سے کسی ایک کی ہمت نے بھی مودودی صاحب سے اتنا دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ جن لوگوں کے پیشے کو آپ قانون خداوندی کے خلاف کھلی بغاوت، اور جن کی روزی کو آپ حرام قرار دیتے ہیں انہیں آپ قانون شریعت کی تدوین و تنفیذ کے لئے دعوت کس طرح دے رہے ہیں! ان میں سے کسی نے بھی ان سے یہ نہیں پوچھا!

۲- اب آگے بڑھیئے۔ کنونشن کے مقررین میں سے ہر ایک نے، اور خود مودودی صاحب نے، تدوین قوانین شریعت کے ضمن میں "کتاب و سنت" کے الفاظ دہرائے اور کہا کہ یہی قانون شریعت کی اساس و بنیاد ہیں۔ بہت اچھا! لیکن مودودی صاحب تو خود اعلان کر چکے ہیں کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو اور ان پر اس کا اطلاق یکساں طور پر کیا جا سکے۔ ان وکلا حضرات میں سے کسی نے مودودی صاحب سے یہ نہ پوچھا کہ جب "کتاب و سنت" کی رو سے ایسا ضابطہ شریعت مرتب نہیں ہو سکتا تو جس ضابطہ کے مرتب کرنے کے لئے آپ نے ہمیں دعوت دی ہے، اس کی بنیاد کیا ہوگی۔ کتاب و سنت

تو (خود مودودی صاحب کے الفاظ ہیں) اس کی بنیاد ہو نہیں سکتی - پھر اس کی اور کونسی بنیاد ہو گی -

ان میں سے کسی نے اسناد پوچھا اور کتاب و سنت کے الفاظ دہراتے چلے گئے۔ اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ حضرات، اور انہیں دعوت دینے والی جماعت اسلامی، نظام شریعت کے مسئلہ میں کس قدر (SERIOUS) ہیں۔

۳- اب آیئے طلب کے اس بند کی طرف، اور یہ دیکھئے کہ اس کنونشن کے انعقاد کی غرض و غایت کیا تھی اور مودودی صاحب کے نزدیک نفاذ شریعت کا عملی طریق کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا:

> اسلامی قانون کے نفاذ کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے انہیں اقتدار سے ہٹا دیا جائے اور ان لوگوں کو اقتدار سونپا جائے جو اسلام جانتے اور مانتے ہوں اور اسے دل سے نافذ کرنا چاہتے ہوں۔ (نوائے وقت، ۳ مئی ۱۹۷۶ء)

فرمائیے! جو کچھ میں کہتا چلا آ رہا ہوں، اس کے لئے اس سے بڑھ کر کسی اور مہر تصدیق کی ضرورت رہ جاتی ہے؟

سوال (۱۱): آپ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب آج ایک بات کو مطابق اسلام قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد اس کے خلاف بات کو اسلام کہہ کر پیش کر دیتے ہیں — ایک صاحب فکر انسان، مزید غور و فکر کے بعد اپنی سابقہ رائے بدل سکتا ہے۔ اس میں کیا ہرج ہے؟

جواب:- ایسا کرنے میں کوئی ہرج کی بات نہیں لیکن ایسے صاحب فکر کے لئے یہ تو ضروری ہے کہ وہ اپنی رائے بدلنے پر اعلان کرے کہ میری پہلی رائے غلط اور خلاف اسلام تھی۔ میں نے اب اس سے رجوع کر لیا ہے۔ (جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے) آپ مودودی صاحب کے ہاں اس قسم کے اعتراف کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے حالانکہ بعض مقامات ایسے تھے جن میں ایسا کرنا نہایت ضروری تھا۔ (مثلاً) مودودی صاحب نے انتخابات (الیکشن) کے سلسلہ میں فیصلہ دیا کہ:-

> ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے ... (اور بعض) امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نا اہل ہونے کی پہلی اور کھلی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب اور جہاں سامنے آئے سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ (ترجمان القرآن - اکتوبر ۱۹۵۱ء)

اس بیان کے خلاف یہ اعتراض ہوا کہ اگر کسی منصب کے لئے امیدوار بن کر اٹھنا خلاف اسلام ہے، اور یہ اس شخص کے غیر صالح ہونے کی دلیل تو حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو منصب خلافت کے لئے خود کیوں پیش کیا تھا؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ حضرت علیؓ کا عمل خلاف اسلام تھا

> اور آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ بزرگان سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی صاف صاف ہدایات دوسری طرف، تو ہمارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانون زندگی قرار دیں۔ جس کا عمل بھی فرمان خدا اور رسولؐ سے مختلف ہو، وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ (ترجمان القرآن - اکتوبر ۱۹۵۱ء)

اس کے چند ہی سال بعد مودودی صاحب کی مصلحتوں کا تقاضا ہوا کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے، تو انہوں نے فیصلہ قرار دیا

کہ ایسا کرنا عین مطابق اسلام ہے۔ انہوں نے لکھا کہ۔

ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔ (ترجمان القرآن - مئی ۱۹۵۸ء)

آپ دیکھئے کہ مودودی صاحب نے یہ نہیں کہا کہ ان کی پہلی رائے غلط اور خلافِ اسلام تھی، اور اب یہ رائے اسلام کے مطابق ہے لیکن بات اس سے بھی آگے چلتی ہے۔ انہوں نے اپنی پہلی رائے کی بنا پر حضرت علیؓ کی شان میں جو گستاخی کی تھی، اس حقیقت کے انکشاف کے بعد کہ حضرت علیؓ کا وہ عمل، خدا اور رسول کے ارشادات کے خلاف لغزش نہیں تھا، انہوں نے اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی کہ خدا سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لیتے ـــ لیکن غلطی کی معافی تو وہ مانگے جو یہ سمجھے کہ اس سے غلطی کا امکان ہے۔ مودودی صاحب اپنے آپ کو اس سے بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ (بقول ان کے برادرِ کلاں سید ابوالخیر مودودی صاحب) وہ اپنے آپ کو "بعد از خدا بزرگ" کے مقام پر فائز تصور کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ)

سوال عنا۔ مودودی صاحب جب اس قسم کا قرآن بدلنے والا اسلام پیش کرتے ہیں تو علماء حضرات کی طرف سے ان کی مخالفت کیوں نہیں ہوتی!

جواب - آپ یہ سوال تو ان علماء حضرات سے پوچھئے۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اس کی دو وجوہات ہیں۔ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت۔ مودودی صاحب جب دارالاسلام (پٹھانکوٹ) گئے ہیں تو ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے علامہ اقبالؒ کی وفات پر لکھا تھا کہ ان کا وہی ایک مادی سہارا تھا جو نہ رہا . . . .

اور آج اس جماعت کی یہ حالت ہے کہ سیم و زر کا سیلاب اُمڈے چلا آ رہا ہے۔ اس وقت پاکستان ہی میں نہیں، دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں میں اس کی شاخیں اور مراکز ہیں جن پر ظاہر ہے کہ لاکھوں روپے صرف آ رہے ہیں۔ مجھے انگلینڈ سے ایک دوست نے، وہاں سے شائع ہونے والے روزنامہ ملت کی ۲۳ رفروری ۱۹۶۷ء کی اشاعت کا ایک تراشا بھیجا ہے جس میں ملتان روڈ (لاہور) پر مرکزی جماعت کے زیرِ تعمیر مرکز (منصورہ) کی تفاصیل درج ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ۱۶۲ کنال اراضی پر زیرِ تعمیر اس مرکز پر ابھی تک چالیس لاکھ روپیہ صرف آ چکا ہے۔ اس ایک مثال سے ان کی دولت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دولت کے بل بوتے پر بہت سی مخالفتوں کا منہ بند کیا جا سکتا ہے۔ (مولانا) عبدالرحیم اشرف نے لکھا تھا کہ ۱۹۵۷ء میں اس جماعت کے کل ارکان کی تعداد (۱۳۰۰) کے قریب تھی اور ان میں (۱۲۰) تنخواہ دار ملازم تھے۔ (المنبر، اکتوبر ۱۹۶۲ء) آج کا حال خدا جانے۔

ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ ان کی پراپیگنڈہ مشینری مخالفت کرنے والوں کا جو حشر کرتی ہے، اس سے ڈر کر بھی لوگ اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ان سے اُلجھا نہ جائے۔ حتیٰ کہ جو لوگ ۱۹۵۷ء میں ان سے الگ ہوئے تھے انہیں بھی کھل کر ان کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔

حقائق و عبر

۱- مہذب دنیا کی نئی نسلیں

مشہور مغربی فلاسفر، پسکال نے لکھا تھا:

> انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے، اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ اور جب ایمان اور محبت کے لئے اسے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بیکار اور خراب مقاصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دست کش ہو جائے تو بُرے راستے اسے خوش آتے ہیں۔ ("انسان نے کیا سوچا؟"۔ ص۲۳۹)

اس وقت یورپ میں بالعموم اور امریکہ میں بالخصوص یہی کچھ ہو رہا ہے۔ وہاں کا نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ، اس مذہب کی فرسودگی سے بیزار بلکہ متنفر ہو گیا، اور دین ان کے ہاں تھا نہیں جو اسے مطمئن کر سکتا اس نے خدا کی جگہ شیطان کی پرستش شروع کر دی۔ اس کی ایک مثال تو ہپی لڑکوں اور لڑکیوں کے وہ غول بیابانی ہیں جو آپ کو پاکستان کے شہروں اور قصبوں میں نشہ میں چور، جھومتے اور رقصاں نظر آتے ہیں۔ ان کا دوسرا طبقہ وہ ہے جن کا وہاں "روحانیت" کے نام سے استحصال کیا جا رہا ہے۔ وہاں اس قسم کے شکاری دھڑا دھڑ بیچ رہے اور "روحانی مراکز" کھول رہے ہیں جن میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، تعلیم، کاروبار، ملازمتیں، دیگر مشاغلِ حیات اور گھر بار تیاگ کر عالمِ بالا کی سیر میں مشغول اور منہمک رہتے ہیں۔ امریکہ سے شائع ہونے والے مجلہ، ریڈرز ڈائجسٹ کی مارچ ۱۹۷۶ء میں شائع ہونے والے ایک تحقیقاتی مقالہ کی رو سے، اس وقت، وہاں دو سو کے قریب ایسے مراکز کھل چکے ہیں۔ ان میں سے تین اہم ترین مراکز کی تفصیلات بھی مقالہ میں دی گئی ہیں جو ملخصاً حسب ذیل ہیں۔

۱- کوریا کا ایک "روحانی پیشوا" جس کا نام، سن۔ منگ۔ مون ہے، ۱۹۷۲ء میں امریکہ میں پہنچا اور اس نے وہاں اپنا مرکز کھولا۔ تین چار سال کے قلیل ترین عرصہ میں قریب تیس ہزار نوجوان اس کے چیلے بن چکے ہیں۔ جن میں سے قریب دس ہزار نے اپنا سارا وقت اس مشن کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ایک اندازہ

کے مطابق، انہوں نے ۱۹۷۵ء میں ایک کروڑ ڈالر کے قریب کما کر مشن کی نذر کیا۔ یہ مشن نیویارک سٹی کے قرب و جوار میں، قریب ایک کروڑ ڈالر مالیت کی جائداد خرید چکا ہے۔ کالج کے طلبا اس کے اولیں ہدف ہوتے ہیں چنانچہ ڈیڑھ سو کے قریب درسگاہوں میں اس کی شاخیں مصروفِ کار ہیں۔ یہی درسگاہیں اس کے "ریکروٹنگ سنٹرز" ہیں۔ نیویارک سے قریب اسّی میل کے فاصلہ پر، اڈھائی سو ایکڑ پر پھیلا ہوا، ان کا تربیتی مرکز ہے۔ یہ معتقدین، مُون کو عصرِ حاضر کا مسیح مانتے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس نے اپنی ذاتی جائداد بھی اچھی خاصی پیدا کر لی ہے۔

۲۔ دوسرا مرکز "مہاراج جی" کا ہے۔ اس کے والد نے بھارت میں اپنا مرکز کھولا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں، جب اس کے لڑکے کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی، اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ مرتے وقت کہہ گیا کہ اس کا یہ بیٹا مکمل گرو ہے۔ ۱۹۷۱ء میں یہ "بچہ گرو" امریکہ آ گیا۔ اس وقت اس کے قریب پچاس ہزار چیلے ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو ہزار کے قریب، ۱۸۵ شہروں کے خصوصی مراکز میں مصروفِ کار ہیں۔ ان کے علاوہ چھ کے قریب مختلف آشرموں میں رہتے ہیں۔ یہ اپنی جملہ املاک اور آمدنی مشن کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ مشن کی موجودہ املاک و مقبوضات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مہاراج جی، شاہزادوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آشرم کے ممبر، تجرد کی زندگی بسر کرنے کے پابند ہوتے ہیں لیکن ۱۹۷۴ء میں گرو جی نے اپنی امریکن سیکرٹری سے شادی رچائی۔ اس پر اس کی والدہ نے یہ کہہ کر اسے مردود قرار دے دیا کہ یہ دھوکہ باز ہے۔ گرو جی نے جواب میں کہا کہ کوئی ماں، گرو جنتی نہیں۔ گرو تو بذاتِ خود گرو ہوتا ہے۔ اس جواب سے اس کے معتقدین مطمئن ہو گئے۔ مشن بدستور پھیلتا جا رہا ہے۔ گیان، دھیان۔ رقص و سرود۔ عیش و نشاط، اس کی خصوصیات ہیں۔ اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو پچھلے سال، مہاراج جی (یا اس کا کوئی نمائندہ) پاکستان بھی آیا تھا۔ اس کے خلاف یہاں صدائے احتجاج بلند ہوئی (کیونکہ یہاں تو پہلے ہی سے بے شمار "روحانی مراکز" قائم ہیں اور رقابت کا احتجاج بڑا شدید ہوتا ہے) اس کے بعد، اس سلسلہ میں کچھ سننے میں نہیں آیا۔

۳۔ تیسرا مرکز، ہری کرشن کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۶۶ء میں، سوامی پربھوپاد نے اسے قائم کیا۔ اس وقت، اس کے قریب سات ہزار ممبر اسی شہروں میں مصروفِ تبلیغ ہیں۔ وہ ناچتے ہیں، گاتے ہیں، ڈھول بجاتے گلیوں میں پھرتے رہتے ہیں۔

ان نوجوانوں کے والدین اور اعزا، ان "روحانی مراکز" کے ہاتھوں تنگ آ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ان کے بچے بیکار محض ہی نہیں بلکہ نفسیاتی مریض بن رہے ہیں۔ ان کی چیخ و پکار سے متاثر ہو کر، وہاں کے ماہرین علم النفس اور دیگر دانشوران قوم نے اس مسئلہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا ہے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں اس کا علاج نہیں آتا۔ ان "اہلِ مراکز" کا کہنا یہ ہے کہ قانون کی رو سے، ہر فرد کو مذہب کے انتخاب کا حق حاصل ہے۔ یہ نوجوان اگر اس مذہب کو اختیار کرتے ہیں تو اس میں کون مداخلت کر سکتا ہے۔

یہ کم و بیش وہی صورتِ حال ہے جو یہاں جماعتِ اسلامی سے متاثر طلبا کے ہاتھوں پیدا ہو رہی ہے۔ یہ

طلبا حصولِ علم کے لئے درسگاہوں میں بھیجے جاتے ہیں لیکن اسلامی جماعت انہیں انتشار پسند سیاست میں الجھا کر کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ ملک چیخ رہا ہے کہ مذہب کے نام پر ان ہونہار بچوں ہی کا نہیں بلکہ بالواسطہ خود اس قوم کا مستقبل تباہ کیا جا رہا ہے لیکن اس کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ عالمِ شباب میں، نوجوان بچے پابندیوں سے آزاد ہونے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ طالب علموں کو جس گوشے کی طرف سے یہ آزادی حاصل ہو وہ اس کی طرف لپک کر چلے جائیں گے ...... خواہ وہ امریکی سپاہیوں کے روحانی مشن ہوں خواہ ہیومنسٹوں کے اباحتی مراکز اور خواہ مذہب کے نام سے انتشار پھیلانے والوں کی تربیت گاہیں۔ اس کا علاج قرآن کے سوا کہیں اور سے مل نہیں سکتا، اور ان مفاد پرستوں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قرآن کی طرف یہ نوجوان جانے نہ پائیں۔

۲۔ ہمارا تاریک مستقبل

پاکستان کی موجودہ قوم، مسلسل پریشانیوں کے بعد، اس قدر مایوسی کا شکار ہو چکی ہے کہ وہ قوم اور ملک سے متعلق مسائل کی طرف سے یکسر بیگانہ (INDIFFERENT) ہو گئی ہے۔ ایسے حالات میں نگاہیں قوم کی آنے والی نسل کی طرف اٹھا کرتی ہیں۔ یہ نسل تعلیم گاہوں میں تیار ہوتی ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں میں کس قسم کی فصل تیار ہو رہی ہے، یوں تو اس کا مشاہدہ سارا سال ہوتا رہتا ہے لیکن امتحانات کے زمانے میں اسٹیج پر سے پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے۔ امسال پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام، بی۔اے اور بی۔ایس سی کے امتحانات ۸ مئی کو شروع ہوئے، اور ۱۲ مئی کو یونیورسٹی کی طرف سے اعلان ہو گیا کہ امتحانات ملتوی کر دیئے گئے ہیں۔ نوائے وقت (بابت ۱۳ مئی) میں شائع ہونے والی اطلاع کے مطابق:۔

> یہ فیصلہ ان شکایات کے بعد فوری طور پر کیا گیا ہے کہ متعدد امتحانی سنٹروں میں نقل کی جا رہی تھی اور کئی مقامات پر اس ضمن میں گڑبڑ ہوئی تھی ...... ادھر آج پولیس ذرائع نے بتایا کہ گذشتہ روز ایم۔اے۔او کالج میں جن طلبا نے ہنگامہ کیا تھا اور ہال میں موجود فرنیچر اور شیشے توڑ دیئے تھے آج پولیس نے اس ضمن میں متعدد طلبا کو حراست میں لے لیا ہے۔ پرانی انارکلی پولیس نے سردار محمد اقبال ٹوکل اور دیگر افراد کی جانب سے ایم۔اے۔او کالج کے امتحانی مرکز کے طلبا کے خلاف قاتلانہ حملہ، ہنگامہ آرائی اور سرکاری فرائض میں مداخلت کے الزام میں مقدمہ درج کر لیا تھا۔

اسی اخبار کی ۱۵ مئی کی اشاعت میں، اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں شائع ہوئی:۔

"پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ امتحانات کی نااہلی، غفلت اور عملے کی ملی بھگت کی وجہ سے ۸ مئی کو شروع ہونے والے بی۔اے، بی ایس سی کے امتحانات شدید دھاندلیوں، بدعنوانیوں اور غنڈہ گردی کے واقعات کے باعث ۱۲ مئی کو ملتوی کرنے پڑے۔ ان چار دنوں میں امتحانی مراکز میں جو کچھ ہوا ہے اور جو الزامات عائد کئے گئے ہیں پنجاب کی تاریخ میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ مختلف امتحانی مراکز میں انگریزی کا پرچہ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اسلامیہ کالج کوپر روڈ پر نئے نصاب کی طالبات کو پرانے نصاب کا پرچہ فراہم کیا گیا اور ان کے احتجاج کے باوجود واپس نہیں لیا گیا۔ اس طرح شعبۂ امتحانات کی نااہلی کی وجہ سے پرچے کے خفیہ ہونے کا تقدس پامال ہوا۔ ایک روز قبل باٹنی کا پرچہ تقسیم کر کے تبدیل کیا گیا۔ ایم اے او کالج کے امتحانی مرکز میں جہاں نقل ہو رہی تھی امیدواروں نے معائنہ ٹیم پر حملہ کر کے انہیں زدوکوب کیا۔ لاہور میں ۶۲

[illegible]

کہ سپرنٹنڈنٹ نے سینٹر فروخت کر دیئے تھے جس کا مشاہدہ ایف سی کالج کے مرکز میں ہوا جہاں مسلح غنڈوں نے نگران عملے کی موجودگی میں گھس کر ہر امیدوار سے جبراً پچاس پچاس روپے وصول کئے جو امیدوار ان کے اس رقم نہیں تھی ان کی گھڑیاں چھین لی گئیں۔ کئی پرچوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ آؤٹ ہو گئے ہیں اور انہیں فروخت کیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے سیکرٹری مسٹر لیاقت بلوچ نے ایک پریس کانفرنس میں الزام عائد کیا کہ انگریزی کا پرچہ بات کو آؤٹ کیا گیا تھا اور اسے شعبۂ امتحانات کے عملے کے تعاون سے فروخت کیا گیا۔ شعبۂ امتحانات کے عملے کی ملی بھگت سے جعلی رول نمبر فراہم کرکے غیر متعلق افراد کو نگران عملے میں بھاری تعداد میں بھرتی کیا گیا اور کھلے عام نگران عملے نے طلبا سے رقم لے کر انہیں نقلیں کرائیں۔ یونیورسٹی سائنس لائبریری کے مرکز کے ساتھ ایک کمرے میں نگران عملے کے ایک رکن نے کتب اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جہاں وہ تین تین امیدواروں کو بٹھا کر نقل کرنے کی سہولت فراہم کرتا تھا۔ پروفیسر وارث میر نے اس منظر پر چھاپہ مار کر اسے پکڑ لیا۔ بتایا گیا ہے کہ لاڑکانہ میں متعلقہ سپرنٹنڈنٹ کھلے عام امیدواروں سے نقل کرنے کیلئے رقم وصول کرتے رہے ہیں۔ عارف ہائی اسکول میں معائنہ ٹیم نے ایک ایسے نگران کو پکڑا جو خود طالب علم تھا۔ اس سکول کے مرکز میں نقل اور دیگر دھاندلیوں کی بنا پر سپرنٹنڈنٹ کو وارننگ دی گئی کہ اگر مزید دھاندلیاں ہوئیں تو اسے معطل کر دیا جائے گا۔ اوچی کو اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ کے امتحانی مرکز کے سپرنٹنڈنٹ نے بدعنوانیوں کی وجہ سے استعفا دیدیا اور اس دوران شعبۂ امتحانات نئے سپرنٹنڈنٹ یا مرکز کا تقرر نہ کر سکا جس کی وجہ سے اوچی کو امیدواروں کو دیگر میں سینٹ ڈل لے جایا گیا اور وہاں ان کا امتحانی مرکز قائم کیا گیا جس کی وجہ سے امتحان تاخیر سے شروع ہوا۔ اس کے بعد اس امتحانی مرکز پر کنٹرولر امتحانات نے چھاپہ مارا اور متعدد امیدواروں کو نقل کرنے کے الزام میں پکڑ لیا۔" ——— یہ ہیں ہمارے وہ نونہالانِ ملت جنہوں نے خیر سے کل کو ملتِ پاکستانیہ بننا ہے۔

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ!

۳۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ٹائم (امریکہ) کی ۱۵ مارچ ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع شدہ خبر کے مطابق، امریکی شہریوں کی کثیر تعداد، شہروں کو چھوڑ کر دیہات کی طرف چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۴ء کے درمیان، دیہات سے شہروں کی طرف منتقل ہونے والوں کے مقابلہ میں، شہروں سے دیہات کی طرف جانے والوں کی تعداد، پندرہ بیس لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس کی وجہ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اگرچہ، دیہات کے مقابلہ میں، شہروں میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے، لیکن شہری زندگی میں (مصنوعی) سامانِ زیست حاصل کرنے کی ہوس اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ انسان کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔ ہم نے اس کا علاج یہی سوچا ہے کہ شہری زندگی ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

لیکن ان سادہ لوح، مضطرب انسانوں کو کون بتائے کہ سوال، شہری اور دیہاتی زندگی کا نہیں۔ تمہارا یہ عدم سکون تو سیکولر نظام کی اس بھڑکائی آگ کی وجہ سے ہے (قرآن کے الفاظ میں) "جس کے شعلے دلوں [illegible] لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔" یہ آگ تو اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے ہی سے بجھ سکتی ہے۔ اور وہ زندگی آج نہ کسی شہر میں نصیب ہو سکتی ہے نہ کسی گاؤں میں۔ اس سکون کی تلاش میں نقل مکانی بھی فریب ثابت ہو گی ——— اور پھر اس کے بعد؟

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

۴۔ تصوّف کی نیرنگیاں!

مغرب کے بڑے بڑے سائنسدانوں، مؤرخوں، فلاسفروں، دانشوروں کے سوانح حیات کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ عمر بھر کی علمی کاوشوں کے بعد، زندگی کے آخری ایام میں کسی آشرم، بھکشوؤں کے بگوڈا، یا (عیسائی) خانقاہ میں پناہ لیتے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض اپنی پہلی زندگی میں خدا تک کے منکر ہوتے ہیں۔ انہیں سکون کی تلاش ہوتی ہے اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ انہیں اس قسم کی خلوت گاہوں میں مل جائے گا۔ عقل انکی اس خود فریبی پر ہنستی ہے اور علم ماتم کرتا ہے۔

لیکن اُدھر سے ہٹ کر اپنی طرف آئیے تو یہاں بھی اس قسم کی کم مثالیں نہیں ملیں گی۔ اس وقت ہمارے سامنے، سید سلیمان ندوی (مرحوم) سے متعلق، چٹان بابت (۱۲) اپریل ۱۹۷۶ء میں شائع شدہ، ایک مقالہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں، کس طرح مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے، اور سندِ خلافت سے سرفراز فرمائے گئے تھے۔ اس کا تو ہمیں علم تھا لیکن اس میں ایک نظم درج ہے جسے سید صاحب نے، "مرشد تھانوی سے بیعت کے ہفتہ عشرہ بعد مرشد کے بارے میں" رقم فرمایا تھا۔ اس نظم کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ تصوف کا نشہ انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیے:۔

پا کر تجھے اپنے کو میں بھول گیا ہوں — ہر سود و زیانِ دوسرا، بھول گیا ہوں
جس دن سے میرے دل میں تری یاد بسی ہے — ہر ایک کو میں تیرے سوا، بھول گیا ہوں
آتا ہے خدا بھی تیرے صدقے میں مجھے یاد — گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں
اب مسئلہ کثرت و وحدت کو میں سمجھا — پا کر تجھے، سب تیرے سوا، بھول گیا ہوں
سجدہ طرف کعبہ ہے، دل تیری طرف ہے — اب قبلہ بھی اے قبلہ نما، بھول گیا ہوں
الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا — افسانۂ پارینہ بھلا! بھول گیا ہوں

اگر ہم آپ کو پہلے نہ بتا دیتے تو کیا آپ کا ذہن، قیامت تک، اس طرف جا سکتا تھا کہ یہ نظم اُس سید سلیمان ندوی (مرحوم) کی ہو سکتی ہے، جس نے (علاوہ متعدد علمی، تحقیقاتی، کتابوں کے) عمر کا بیشتر حصہ سیرت النبیؐ جیسی چار پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب کی تالیف میں صرف کیا تھا۔ آپ دیکھئے کہ تصوف کا ہفتہ عشرہ کا سیلاب کس طرح عمر بھر کے اس سرمایہ کو بہا کر لے گیا اور سید صاحب کو منگتوں کی صف میں کھڑا کر گیا۔ سچ کہا تھا ریاض خیرآبادی نے کہ

صد سالہ دورِ چرخ تھا، ساغر کا ایک دور — نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

"عشق" ازیں بسیار کرد ست و کند — اور یہ سارا کرشمہ ہوتا ہے کمزور قوتِ ارادی (WILL POWER) کے انسان کے اعصاب پر، مقابلتہً طاقتور قوتِ ارادی والے انسان کی توجہ کے اثر کا جسے "روحانیت" سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ قوت مختلف مشقوں سے بڑھائی جا سکتی ہے۔ مغرب میں انہیں ہپناٹک مشقیں کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں انہیں چلّوں، مراقبوں، ریاضتوں، ورد وظیفوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تصورِ شیخ اس کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم، انسانیت کو اس قسم کی توہم پرستیوں سے نجات دلانے کے لئے آیا تھا۔

۵۔ کیا ہے کوئی اہلِ رشید؟

جماعت اسلامی کے ترجمان "ایشیا" کی (۲۵) اپریل ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، مودودی صاحب کا درسِ قرآن شائع ہوا ہے جو آیت وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کی تفسیر میں ہے۔ اس میں مودودی صاحب نے فرمایا ہے:۔

> قرآن کریم کے اس صاف اور صریح حکم کی موجودگی میں اس بات کی آخر کیا گنجائش ہے کہ مسلمان عورتیں، کونسلوں اور پارلیمنٹوں کی ممبر بنیں۔ بیرونِ خانہ کی سوشل سرگرمیوں میں دوڑتی پھریں۔ سرکاری دفتروں میں مردوں کے ساتھ کام کریں۔ کالجوں میں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں اور تعلیم و تربیت کے لئے امریکہ اور انگلستان بھیجی جائیں۔ (ص۲)

ہم معلوم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اس ساری جماعت (اسلامی) میں ایک "رجلِ رشید" بھی ایسا نہیں جو اپنے بانیٔ جماعت سے اتنا پوچھنے کی جرأت کرتا کہ جب قرآن کریم کے صاف اور صریح حکم کی رُو سے، اس کی کوئی گنجائش نہیں کہ مسلمان عورتیں، کونسلوں اور پارلیمنٹوں کی ممبر بنیں، تو آپ نے ہمیں جو حکم دیا تھا کہ ہم (کونسل یا پارلیمنٹ کی ممبر شپ کے لئے نہیں بلکہ) منصبِ صدارت کے لئے الیکشن میں محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی حمایت کریں، — اور ہم نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں — قریہ قریہ، بستی بستی، پھر کر، ان کی حمایت کی تھی — تو آپ کا وہ حکم کونسے قرآن کی رُو سے تھا؟ کیا صالحین کے اس سارے گروہ میں، ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کی اپنی حمیت ایسا پوچھنے کی جرأت دلا دے؟

اور آگے بڑھیئے۔ پچھلے دنوں وزیراعظم بھٹو نے کوئٹہ کے ایک اجلاس میں، پس پردہ بیٹھی ہوئی خواتین سے کہا کہ وہ پردہ سے باہر آکر بیٹھا کریں۔ چنانچہ وہ باہر آگئیں۔ مودودی صاحب نے، جماعت سے وابستہ خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے پردہ کے متعلق خدا اور رسولؐ کے احکام پر گفتگو کی، اور اس کے بعد کہا کہ:۔

> کوئی شخص جو اسلام کا علم رکھتا ہو تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے خلاف غور کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا کجا یہ کہ وہ دوسروں سے کہے کہ تم اللہ اور رسولؐ کے احکام کو توڑو اور بیچ میدان کے آجاؤ۔

ہم اس وقت پردہ سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔[1] ہم جماعت اسلامی سے متعلق حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ میں کوئی ایک بھی ایسا صاحب ہمت نہیں جو مودودی صاحب سے پوچھے کہ آپ نے ہمیں خدا اور اس کے رسولؐ کے ان احکام کو توڑ کر محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی حمایت کا حکم کیوں دیا تھا، جنہوں نے ساری عمر پردہ نہیں کیا تھا؟

ہم ان حضرات سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ خدا کے بندو! ذرا سوچو کہ آپ کو بنا کیا دیا گیا ہے؟ آپ اس قدر ہپناٹائزڈ کیوں ہو چکے ہیں کہ جو کچھ ان صاحب کی زبان سے نکلتا ہے آپ بلا سوچے سمجھے مشینی آدمی کی طرح اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ آپ اتنا تو سوچیئے کہ آپ کل، خدا کو کیا جواب دیں گے؟

---

[1] اس کے لئے دیکھئے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتاب — طاہرہ کے نام خطوط۔

مقامِ حدیث

کا تازہ ایڈیشن بہت سی ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ، شائع ہو گیا ہے۔

یہ وہ کتاب ہے :-

- جس میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ دین کے نظام میں حدیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔
- جس میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ مخالفین اسلام نے کس طرح ہمارے احادیث کے مجموعوں میں ایسی وضعی روایات داخل کر دیں جن سے اسلام مسخ، اور حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کا کردار داغدار ہو کر سامنے آئے۔
- جس میں اس سازش کا انکشاف کیا گیا ہے جس کی رو سے کوشش کی گئی کہ قرآن کریم پر مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔
- جس میں مثال کے طور پر "ان احادیث" کو پیش کیا گیا ہے جن کی نسبت حضورؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ لیکن جن کے متعلق آپ ایک نگاہ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضورؐ کے ارشادات نہیں ہو سکتے۔
- اس میں بتایا گیا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعے کس طرح مرتب کیے گئے اور ان کے مرتب کرنے والے کون تھے؟
- اس کتاب کا مطالعہ، آپ کی معلومات میں بیحد اضافہ کرے گا اور آپ کو بے شمار کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دے گا۔
- اور اس کتاب سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث مشہور کرنا، کتنا بڑا جھوٹ ہے۔

کتاب عمدہ بکس بورڈ کور کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ قیمت -/۱۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

(۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

تقریبات و اعلانات

یومِ اقبالؒ ـــــ لائل پور

بزمِ طلوعِ اسلام لائلپور کے زیرِ اہتمام ۲۳ اپریل ۱۹۷۶ء کی شام ڈسٹرکٹ کونسل ہال لائلپور میں یومِ اقبالؒ کی تقریب اس شایانِ شان طریق سے منائی گئی کہ کشش کا یہ عالم تھا کہ وقت سے پہلے ہی ہال بھی بھر چکا تھا اور باہر سامعین منتظر تھے۔ ساڑھے سات بجے کے قریب تلاوتِ قرآن پاک اور کلامِ اقبالؒ سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ بزمِ طلوعِ اسلام ساہیوال کے نمائندہ چوہدری عطاء اللہ صاحب ایڈووکیٹ زینت گرمسندِ صدارت ہوئے۔ آٹھ بجے کے قریب محترم پرویز صاحب مائیک پر تشریف لائے۔ خطاب کا عنوان تھا ـــ متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی ـــ نہایت پُرسکون و پُرسکوت ماحول میں دس بجے تک خطاب جاری رہا اور اس کے بعد سوالات کے جوابات نہایت مسکت طریق سے دیئے گئے۔ بزمِ لائل پور کے اراکین کے علاوہ بزمِ لاہور اور، بزمِ گجرات، بزمِ جلالپور جٹاں، بزمِ سرگودہا، بزمِ میانوالی، بزمِ کمالیہ، بزمِ ساہیوال، بزمِ جھنگ وغیرہ نیز بزمِ کراچی کے نمائندگان و اراکین شریکِ اجتماع تھے۔ تقریب بڑی کامیاب رہی جس کے لئے بزمِ لائلپور کے نمائندہ محترم ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب اور ان کے رفقاء مستحقِ مبارک باد ہیں۔

یومِ اقبالؒ ـــــ لاہور

۲۵ اپریل ۱۹۷۶ء اتوار کی صبح، قرآنی درس گاہ میں اجتماع ہوا۔ خصوصی درس کا عنوان ـــ متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی ـــ تھا۔ سامعین کی تعداد بڑی کثیر تھی۔ یہ خطاب طلوعِ اسلام کی مئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مختلف گوشوں سے موصول شدہ کچھ استفسارات کے جوابات، خطاب کے تتمہ کی شکل میں حالیہ اشاعت میں شامل ہیں۔ خطاب اور اس تتمہ کو الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ اشاعتِ عامہ کی خاطر اس کی قیمت صرف ایک روپیہ فی نسخہ رکھی گئی ہے۔

---

(۱) پرچہ نہ ملنے کی شکایت پندرہ تاریخ تک مل جانے پر دوبارہ بلا قیمت بھیجا جاتا ہے۔ اُس کے بعد اطلاع ملنے پر بصورتِ موجودگی، قیمتاً دوبارہ بھیجا جائے گا۔

(۲) خط و کتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ دینا مت بھولئے۔

(۳) جوابی امور کے لئے جوابی خط لکھئے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

۲۵/بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور

بزمِ مذاکرہ

(طلوعِ اسلام کنونشن - ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

موضوع:-
یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں، ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

صدارت
نشستِ اول:- محترمہ مسز رابعہ ٹوار (لنڈن)
نشستِ دوم:- محترمہ ثریا عندلیب (لاہور)

شرکائے مذاکرہ
(حسبِ ترتیبِ شرکت)

۱ - راشدہ اقبال (جماعت ہشتم - ملتان)
۲ - نویدالطاف (جماعت ششم چاس عنا شمالی)
۳ - سلمیٰ لطیف (جماعت دہم - لاہور)
۴ - ثریا عندلیب
۵ - اعجاز احمد (جماعت دہم - جہلم)
۶ - نگہت سلطانہ (ایف ایس سی - سالِ دوم - لاہور)
۷ - ابرار احمد (ایم اے - سالِ اول - لاہور)
۸ - صالحہ نغمی (بی ایس سی - سالِ دوم - لاہور)
۹ - اعجاز یوسف (جماعت ہفتم - لاہور)
۱۰ - نعمانہ اکبر (ایف ایس سی - سالِ اول - لاہور)
۱۱ - شوکت پرویز (سویڈش - پاک انسٹی ٹیوٹ - گجرات)
۱۲ - نجیبہ فاروقی (ایم اے - سالِ اول - لاہور)
۱۳ - رانی (جماعت پنجم) } دو دو فقروں کی تقریریں
۱۴ - گوگی (جماعت ہفتم) }
۱۵ - نجمہ صفدر (بی اے)
۱۶ - سلمیٰ پرویز (ایم اے)

(قسط اوّل)

۱۔ راشد اقبال

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

صاحبِ صدر محترم باباجی و معزز سامعین!

یہ ہے آج کا موضوع۔ جیسا کہ موضوع سے ظاہر ہے۔ زندگی کے میدان میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ جن کے سامنے ایک صحیح اور واضح مقصد ہو، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سچی لگن سے جد و جہد کریں۔

جنابِ من! انسان بے پناہ قوتوں کا مالک ہے۔ اِس میں بہت سی صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن اِن کو اجاگر کرنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ عمل کی ضرورت ہے۔ اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر کے انسان ساری دنیا پر غالب آ سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی قوم کو بہت ہی قیمتی سرمایہ بخشا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس قوم کے افراد اسے صحیح طور پہ استعمال نہ کر سکے۔ جس طرح قرآن اب صرف ثواب حاصل کرنے کے لئے پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح اقبالؒ کا کلام قوالوں کی مجالس میں گایا جاتا ہے۔ اِس پہ غور و فکر کر کے عمل نہیں کیا جاتا۔ اِس سے مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ہمارے ایک ملنے والے، بہت ہی مذہبی قسم کے آدمی ہیں اور ہمیں پرویزی کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں نے ان سے ایک دو دفعہ کہا کہ آپ پرویز صاحب کی کتابیں پڑھ کر تو دیکھیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ تو کہنے لگے کہ نہ بھائی! میں نہیں پڑھوں گا۔ میں نے چند ایک پڑھی ہیں لیکن معلوم نہیں ان میں کیا جادو ہے کہ آدمی خود بخود ان کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے!

میں نے عرض کیا کہ محترم! وہ ہے غور و فکر کا جادو، جس پر انسان عمل کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ بغیر عمل کے علم بھی بیکار ہے۔

لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ قرآن پڑھتے ہیں۔ لیکن اس پہ عمل نہیں کرتے۔ مجھے اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ کہنا پڑھتا ہے کہ

مصلّہ، تسبیح و لوٹا، تصوّف کی سمجھدانی
فرارِ زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

جنابِ من! زیر بحث شعر میں تیسری خصوصیت محبت و ہمدردی ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرسکنے کے لئے ان کا موجود ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ انسان اس سے ہر مشکل کام کو آسان بنا سکتا ہے۔ اِن صفات کے ایک جگہ ہونے سے صحرا میں پھول کھل سکتے ہیں۔ اس سے قوم میں اتفاق پیدا ہوتا ہے۔ پختہ ارادہ اور لگاتار جہد و جہد کو محبت و ہمدردی کا رنگ دے کر اگر ہم عمل کریں تو ہم بھی یقیناً

مغرب کے مقابل آسکتے ہیں۔ بلکہ صفِ آدمیت میں ان سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ان چیزوں کے نہ ہونے سے ہم ان سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ کبھی مغرب والے ہماری تقلید کرتے تھے آج ہم ان کی تقلید کر رہے ہیں۔ زندگی کی ہر دوڑ میں وہ ہم سے آگے ہیں۔ کاش! ہماری قوم میں یہ خصوصیات پھر سے آجائیں، تاکہ ہم بھی ایک زندہ قوم کہلا سکیں۔ شکریہ

۲۔ نوید الطاف

محترمہ صدر صاحبہ اور محترم بزرگو! السلام علیکم

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اور اس میں جتنی اشیاء پیدا کیں سب کے متعلق قوانین مقرر کر دیئے۔ تمام اشیائے کائنات ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ قوانین اٹل ہیں۔ انہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ جب اس صفحۂ ارض پر انسان کی نمود ہوئی۔ تو اس کے لئے بھی خدائے کریم نے ایک مکمل ضابطۂ زندگی نازل فرمایا جو انسان کو سرکارِ دو عالم نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے عطا ہوا۔ لیکن انسان کی کیفیت دیگر اشیاءِ کائنات سے مختلف ہے۔ یعنی یہ اس ضابطۂ زندگی میں دیئے گئے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ بلکہ اس کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ؛ اگر اس کا جی چاہے تو قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی گزارے اور اگر چاہے تو ایسا کرنے سے انکار کر دے۔

اِس ضابطۂ زندگی کو زبانِ وحی میں قرآنِ کریم کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ جس کا اثر اس کی اس دنیا کی زندگی پر بھی پڑتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی پر بھی۔ اچھے اعمال کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے اور بُرے کاموں کا نتیجہ بُرا۔ اِسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان لے آئے اُسے مومن کہتے ہیں۔ اور انکار کر دینے والا کافر کہلاتا ہے۔ مومن کی تعریف یہ ہے کہ ایمان اُس کے دل کی گہرائیوں میں اس طرح پیوست ہو کہ دنیا کی کوئی طاقت اُسے متزلزل نہ کر سکے۔ قرآنِ کریم ایمان کے ساتھ عمل اور پیہم عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ اِس کا شروع سے آخیر تک مطالعہ کیجئے، ہر جگہ ایمان اور اس کے ساتھ عمل کی تاکید نظر آئے گی۔ ایمان مقصدِ زندگی متعین کرتا ہے۔ اور عمل اس مقصدِ زندگی کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کا نام ہے۔ اس لئے ایک مومن کی زندگی پیہم سعی و عمل کی زندگی ہے۔ ترکِ عمل سے مومن، مومن ہی نہیں رہتا۔ قرآنِ کریم میں جہاں اٰمَنُوْا آیا ہے اس کے ساتھ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بھی آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صرف قولوں۔ کلموں اور لفظوں سے مقصدِ زندگی حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایمان کے ساتھ انتھک کوشش اور شبانہ روز عمل کی ضرورت ہے۔ مومن کا ایمان اور عمل، صداقت۔ محبت۔ اخوت۔ شفقت۔ حسنِ معاملہ۔ ایفائے عہد اور پاکیزگیٔ خیالات جیسے امتیازی نشانات کا حامل ہوتا ہے۔ مومن اپنے حسنِ کردار سے لوگوں کے دلوں کو اپنا گرویدہ کرتا ہے۔ کسی کو اگر قید کر لیا جائے یا طاقت کے زور پر اپنا محکوم بنا لیا جائے تو اس سے نہ اس کا دل جیتا جا سکتا ہے۔ نہ اُس کے

خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ مومن اپنے قول و فعل کی پاکیزگی اور حسنِ کردار سے دشمن کے دلوں پر بھی فتح پاتا ہے۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

ہماری تاریخ مومنین کے ایسے کارناموں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ:-

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم جہانِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

لیکن قبلہ باباجی اور محترم بزرگو! میں مسلمانوں کی موجودہ روشِ زندگی کو قرآن کی تعلیم اور اس شعر کے مفہوم کے بالکل برعکس پاتا ہوں۔ سب سے پہلے مذہبی پیشوائیت کو لیتا ہوں۔ انہوں نے فرقہ بندی کی بناء پر الگ الگ مسجدیں تعمیر کر رکھی ہیں جن میں دھواں دھار تقریروں کے ذریعہ تفرقہ بازی کو ہوا دیتا اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کو ابھارنا اِن کا کام ہے۔ عبادت کا اس قدر غلط مفہوم اپنے مقتدیوں کے ذہنوں میں بٹھا دیا ہے کہ قوم وظیفوں، تسبیحوں اور تعویذوں کے عمل پر لگ گئی ہے۔ کچھ رات بھر ورد وظیفہ میں مصروف رہ کر جاگتے اور دن کو لمبی تان کر سوئے رہتے ہیں۔ کچھ دن کو جاگتے تو ہیں، لیکن اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ان کے ہونٹ کچھ پڑھنے میں اور ہاتھ تسبیح روندنے میں لگے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس دین و دنیا کے معاملات پر غور و فکر کرنے اور ہاتھوں سے کوئی دوسرا کام کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ یہ لوگ عقل و فکر سے عاری اور بیکاری کے مجسمے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی درسگاہوں میں زیرِ تعلیم نوجوانوں کو درویش طالب علم کہا جاتا ہے۔ جن کو قرآن مجید ناظرہ پڑھایا جاتا نیز حفظ کرایا جاتا ہے۔ اپنی شکم پری کے لئے درسگاہ کے نام پر چندہ جمع کرنے کی خاطر ان درویشوں سے گداگری کرائی جاتی ہے۔ اس طرح بھیک مانگنے میں وہ ماہر ہو جاتے ہیں۔ کئی سالوں کے بعد ان درس گاہوں سے وہ اپنے خیال کے مطابق عالم بن کر نکلتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں کوئی ذریعۂ روزگار نہیں ہوتا۔ اِس لئے وہ گاؤں گاؤں پھر کر مسجدوں میں وعظ کرتے اور کئی حیلوں اور بہانوں سے صدقہ و خیرات مانگ کر بسر اوقات کرتے ہیں۔ گویا یہ درسگاہیں مذہبی گداگر پیدا کر رہی ہیں۔ پہلے ہی پیشہ ور گداگروں کی اس قوم میں کوئی کمی نہ تھی جو ملک و قوم کیلئے نہ صرف شرم و ندامت کا باعث ہیں بلکہ قومی ترقی کے لئے سنگِ راہ ہیں۔

اِن درسگاہوں سے نکل کر اب عام معاشرہ کی طرف آیئے۔ پہلے سرکار کے ملازمین اور محکموں کو لیجئے۔ سرکار کا ہر محکمہ از سرتاپا رشوت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ دفتروں اور عدالتوں میں عوام کو جن پریشانیوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس قسم کے غیر انسانی سلوک سے ان سے پیش آیا جاتا ہے وہ بڑا روح فرسا اور رنجدہ ہوتا ہے۔ عدالتوں میں گواہ بلا جھجک جھوٹ بولتے ہیں اور ہمارے معاشرہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دانشور شمار ہونے والا وکلاء کا طبقہ انہیں سکھا پڑھا کر اُن سے جھوٹ بلواتا ہے۔

کاروبار کو دیکھئے۔ کوئی کاروباری یا تجارتی اصول نہیں رہ گیا۔ گاہکوں سے منہ مانگی قیمتیں وصول کی جاتی ہیں ذخیرہ اندوزی، چور بازاری۔ اشیاء میں ملاوٹ اور کم ناپ تول ہمارے دوکانداروں کے اصول قرار پا گئے ہیں۔ ایمانداری اور دیانتداری منہ چھپائے پھرتی ہے۔

عوام کی اخلاقی پستی کی یہ حالت ہے کہ انصاف، سچائی، پاکیزگی، دیانت اور ہمہ گیر محبت کی جگہ جھوٹ، بددیانتی، رشوت، فریب اور حرام کاری کا سکہ رائج ہے۔ نوجوان طبقہ غنڈہ گردی میں فخر محسوس کرتا ہے۔ چاقوؤں، چھروں، پستولوں اور بندوقوں جیسے مہلک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کرنے اور جبراً اغوا کر کے بے بس عورتوں کی عصمتیں لوٹنے بھرتے ہیں۔ ان خون خوار درندوں کے ہاتھوں کئی مظلوم آئے دن موت کے گھاٹ اُترتے رہتے ہیں۔ اس بدکرداری میں پڑھے ہوؤں اور اَن پڑھوں میں کوئی تمیز نہیں ہے۔ بلکہ پڑھے ہوئے اَن پڑھوں سے بدتر ہیں۔

میرے بزرگو! میں اپنی قوم کی بداعمالیاں کہاں تک گناتا جاؤں۔ یہ تو ختم ہونے میں نہ آئیں گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری قوم اخلاقی لحاظ سے زندگی کی اِس پست سطح پر کس طرح پہنچی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے اور صرف یہ ہے کہ اِس قوم نے اپنے ضابطۂ زندگی یعنی قرآنِ کریم سے قطع نظر کر لی ہے اور اس کی تعلیمات کو بھلا دیا ہے۔ جن پر عمل پیرا ہونے سے پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار پیدا ہوتی تھی اور دینی و دنیوی خوشگواریاں سربلندیاں حاصل ہوتی تھیں۔ لیکن قرآن پڑھنے کا مقصد اب تو صرف مُردوں کو بخشوانا رہ گیا ہے۔ جو اسے پڑھتے ہیں وہ سمجھتے نہیں۔ گویا انسان نہیں طوطے ہیں۔ جب تک اِسے سمجھ کر نہ پڑھا جائے۔ ایمان کی پختگی۔ اعمالِ صالح اور محبت، احسان اور مروت جیسی خوبیاں کیسے پیدا ہوں۔

قبلہ باباجی! اس راہ گم کردہ قوم پر آپ کا بڑا احسان ہے کہ آپ اس بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم بلا رہے ہیں اور مسلمانوں میں قرآنی فکر پیدا کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ آپ کی یہ محنت اور عرق ریزی خدا کے فضل سے بارآور ہو رہی ہے اور انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب اس قوم میں ایسے مومن مردوں کی کمی محسوس نہیں ہوگی جن پر حضرتِ علامہ کا یہ شعر صادق آ سکے ؎

یقین محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

والسلام

۳۔ سلمیٰ لطیف

بندگانِ من!

ہر چند کہ خواتین کو ایک ایسے موضوع پر اظہارِ خیال کرنا زیب نہیں دیتا جس میں مخاطب صرف مرد کی ذات ہو۔ لیکن مرد جب حرص و ہوس کی چوڑیاں پہن کر اپنی ذمہ داریاں بھول جائیں تو پھر خواتین کو ناچار میدان میں نکلنا پڑتا ہے۔ لہٰذا علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ میں اس شعر کو یوں پڑھوں گی کہ ؎

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں عورت کی تدبیریں

یہ شعر اگرچہ زبانِ زدِ عام ہے۔ اور بظاہر کچھ مشکل بھی نہیں، لیکن جب میں نے اِس کے معنیٰ پر غور شروع

کیا تو بات لیقین محکم ہی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اُستانی نے اس کا مطلب ایمان بتایا، اور جب لفظ ایمان کی وضاحت چاہی تو کہنے لگی "تُف ہے! کیسا زمانہ آگیا مسلمانوں کی بچیوں کو ایمان کا مطلب بھی نہیں آتا۔" سہیلیوں سے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ ایک میں ہی نا آشنا نہیں بلکہ اس لفظ کا واضح مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں۔ خیال تھا کہ اب میں کافی بڑی ہو گئی ہوں۔ اس لئے مضمون اپنے ابو جان کی مدد کے بغیر لکھوں گی، لیکن بات بن نہ پائی اور بالآخر ان ہی سے رجوع کرنا پڑا۔

میرے ابو الیکٹرانکس انجینئر ہیں۔ اس لئے انہوں نے ایمان کا مطلب بھی مجھے الیکٹرانکس ہی کی مثال دے کر سمجھایا۔ انہوں نے بتایا کہ ایمان کا مطلب ہے "سمت متعین کرنا" الیکٹرانکس کی اصطلاح میں اسے (TUNING - ٹیوننگ) کہتے ہیں۔ اور اس کی مثال انہوں نے یوں دی کہ دنیا میں بے شمار ہزاروں ریڈیو سٹیشن اپنی آواز نشر کرتے ہیں اور یہ تمام آوازیں برقی لہروں کی شکل میں ہمارے گرد ہمہ وقت موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارا ریڈیو ان ہزاروں آوازوں میں سے صرف ایک آواز سناتا ہے۔ جس کے لئے سوئی گھما کر اُسے (TUNE) ٹیون کر دیا جاتا ہے۔ اب آپ ذرا غور کیجئے کہ ٹیوننگ کے اس عمل میں ہم باہر سے آنے والی لہروں کی نہ تو سمت تبدیل کر سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں دبا سکتے ہیں۔ بلکہ ہم کرتے یہ ہیں کہ اپنے ریڈیو سیٹ کو ان میں سے مطلوبہ لہر کے ہم آہنگ کر دیتے ہیں، اور اس طرح غیر مطلوبہ لہریں ہمارے سیٹ پر اثر انداز نہیں ہو پاتیں۔ دراصل ہمارے ریڈیو سیٹ کے اندر ایک ری جیکٹر (REJECTOR) یعنی رد کرنے والا اور دوسرا ایکسپٹر (ACCEPTOR) یعنی قبول کرنے والا سرکٹ ہوتا ہے۔ ہم ٹیوننگ (TUNING) کے عمل میں "رد و قبول" کا امتزاج اس طرح متعین کرتے ہیں کہ مطلوبہ سٹیشن تو ہمیں سنائی دے۔ لیکن غیر مطلوبہ سٹیشن خواہ وہ کتنا ہی نزدیک اور طاقتور کیوں نہ ہو۔ اس میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد ہم کہتے یہ ہیں کہ ہمارا ریڈیو فلاں سٹیشن کے ساتھ (TUNED) ٹیونڈ ہے۔ یا وہ سٹیشن ہمارے ریڈیو کے ساتھ ٹیونڈ (TUNED) ہے۔ اگر کسی وجہ سے ری جیکٹر سرکٹ ماند پڑ جائے تو ایکسپٹر سرکٹ اپنی تمام تر صحت کے باوجود بے کار ہو جاتا ہے۔ ایسا ریڈیو کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مومن، یعنی ایمان والا، اُسے کہتے ہیں۔ جس کا قلب و ذہن اس طرح ٹیونڈ (TUNED) ہو کہ اس میں حکم خداوندی کے سوا کوئی دوسری بات قبول کرنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ دین کی زبان میں انسانی ذہن کا ری جیکٹر سرکٹ لا الٰہ اور ایکسپٹر سرکٹ الا اللہ ہے۔ اصولی طور پر کام کرے تو اُسے ایمان کہتے ہیں۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لانے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن لا الٰہ کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ اور یہ تو میں بتا ہی چکی ہوں کہ اصولی طور پر ایکسپٹر سرکٹ اس وقت تک کارآمد نہیں ہوتا جب تک ری جیکٹر سرکٹ بھی اسی رفتار سے مؤثر عمل نہ ہو۔ "ٹیونڈ ذہن" کو مومن۔ ایسا ٹیونڈ کہ ہر سمت سے کٹ کر اُس ایک سمت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے اور اس کی تمام تر توجہات کا مرکز وہی اور صرف وہی ذات ہو۔ اور بزرگانِ من! کیا آپ کو یاد نہیں کہ یہی تو بات تھی جو ہمارے جدِ امجد

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایمان کی وضاحت کرتے ہوئے آج سے ہزاروں سال پہلے کہی تھی۔ کہ: اِنّی وجّہت وجہی للّذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا۔ اور یہی کچھ تو ہے جو مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو۔ اپنا "رخ" مرکزِ محسوس کعبہ کی طرف رکھو۔ لہٰذا مختلف اطراف سے کٹ کر ایک رُخ کا تعین اور پھر اپنے آپ کو اس رُخ سے ہم آہنگ کر لینے کا نام ہی تو ایمان ہے۔ اور پھر توبہ کرو تو معلوم ہی ہے کہ جب ایسا ہو جاتا ہے۔ تو پھر کہا یہ جاتا ہے — "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" یعنی وہ محدود سے کٹ کر لامحدود کے ساتھ (IN-TUNE) ہو جاتے ہیں۔ اور لامحدود ان کے ساتھ (TUNE) ٹیون ہو جاتا ہے — یہاں میں پھر واضح کر دوں کہ لامحدود ٹیون (TUNE) ہو جانے کی شکل اسی طرح ہے جس طرح ایک ریڈیو سٹیشن اپنی تمام تر خود مختاری کے باوجود ہمارے ریڈیو سیٹ کے ساتھ ٹیون ہو جاتا ہے اور اس وقت تک ٹیون (TUNE) رہتا ہے۔ جب تک ہمارا ریڈیو سیٹ اس سٹیشن کے ساتھ (IN TUNE) رہے۔ "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" اسی کو یقینِ محکم کہتے ہیں۔ کہیئے! ہے کوئی شمشیر اس سے زیادہ کارگر؟

بات آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ تم نے دیکھا جب بھی ریڈیو سیٹ کسی وجہ سے (MIS TUNE) مس ٹیون ہو جائے تو اس میں سوائے بڑبڑ کے کوئی آواز نہیں آتی۔ اور اس کا عمل پیہم برقی توانائی صرف کرنے کے باوجود کوئی کارآمد نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ بات اب میری سمجھ میں آئی کہ ہماری کوشش رائیگاں اور ہمارے اعمال کیوں نتیجہ خیز نہیں ہوتے اور کیوں نیک اعمال سے پہلے ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ ہماری مثال اس (MIS-TUNED) مس ٹیونڈ ریڈیو سیٹ کی طرح ہے جس کا کوئی مصرف نہیں۔ لیکن کیا ایک مس ٹیونڈ سیٹ کو پھر سے کارآمد بنانا ممکن ہے۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹی کیوں نہیں"۔ انہوں نے بتایا کہ اس کے لئے ہمارے پاس ایک ٹسٹ سگنل ہوتا ہے۔ جسے ہم مس ٹیونڈ سیٹ میں سے گزارتے ہیں۔ اور جہاں کہیں کجروی پیدا ہو گئی ہو اُسے درست کر دیتے ہیں۔ اس طرح ریڈیو سیٹ پھر سے کارآمد ہو جاتا ہے۔

بزرگانِ من!

مجھے نہیں معلوم کہ یہ مثال "شرعی" ہے یا "غیر شرعی" لیکن اس مثال سے کم از کم میں ایمان کی حقیقت تو سمجھ گئی ہوں۔ اور مجھے وہ راز بھی معلوم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے لوگ "باباجی" کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

میں نے لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ طلوعِ اسلام والوں کے ہاں جو ایک دفعہ چلا گیا وہ وہیں کا ہو گیا۔ میں سوچتی تھی کہ "باباجی" کے پاس وہ کونسا جادو ہے کہ جو ایک دفعہ ان کی بات سن لیتا ہے۔ وہ دوبارہ ان کے پاس نہ بھی آئے تو جاتا کہیں اور بھی نہیں — مجھے اب معلوم ہوا کہ "باباجی" کے پاس کوئی جادو نہیں۔ دراصل ان کے پاس وہ ٹسٹ سگنل ہے جو کسی ذہن سے ایک دفعہ گزر جاتا ہے۔

وہ اِس ذہن کا زاویہ اس طرح درست کر دیتا ہے کہ وہ ذہن خود بخود صحیح سمت میں سوچنا شروع کر دیتا ہے اور جتنا زیادہ سوچتا ہے اتنا ہی زیادہ ٹیونڈ (TUNED) ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جتنا زیادہ وہ ٹیونڈ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ عجمی اعتقادات سے کٹتا چلا جاتا ہے۔ اور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ آدمی اب کہیں اور کا نہیں رہا۔ وہ ٹسٹ سگنل ہے۔

"اللہ کی کتاب، قرآن"

اور اِس ٹسٹ سگنل پہ انحصار کی حد یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے۔

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے تھا

بزرگانِ من!

میں اِس دفعہ اپنا پرانا مطالبہ نہیں دہراؤں گی[1] مجھے عرض کرنا ہے تو فقط یہ کہ آپ کے ریڈیو کی ٹیوننگ ذرا سی خراب ہو جائے تو آپ کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ لیکن ذہنی طور پہ ایک مس ٹیونڈ نسل کا باپ کہلانے میں آپ کو کوئی عار نہیں ——— کیا انتظام کیا ہے آپ نے اپنے بچوں کی ذہنی ٹیوننگ کا؟ ——— کیا آپ کے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ آپ ان بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان کے لئے الگ درسِ قرآن کا ہی انتظام کر دیں یا کم از کم بچوں کے لئے "بابا جی" کی آواز میں کیسٹ ٹیپ ہی فراہم کر دیں[2] تاکہ آپ کے ان بچوں کو ایمان کا مطلب جاننے کے لئے در در کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔ کیا آپ کی بیٹیاں آپ سے اتنی توقع بھی نہیں رکھ سکتیں؟ شکریہ

۴۔ ثریا عندلیب

صدرِ عالی مقام و حاضرینِ کرام! السلام علیکم

آج کے مذاکرے کی سنجیدہ و فہمیدہ مگر شگفتہ و تابندہ قرآنی محفل میں ہمارا موضوعِ سخن اور نکتۂ غور و فکر حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا وہ حقیقت کشا اور بصیرت افروز شعر ہے جسے دوسرے لفظوں میں جماعتِ مومنین کا دستور العمل یا نصب العین حیات کہا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم!
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

آگے بڑھنے سے پیشتر یہاں ایک وضاحت کرتی چلوں تاکہ میری جن سننے والوں بہنوں اور بیٹیوں کے دل میں مذکورہ شعر میں "مردوں" کے لفظ سے جو کھٹک سی پیدا ہوئی ہے وہ دُور ہو جائے ——— یہاں مردوں سے مراد مومنین ہیں جن میں مرد و عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ یہ ایک اصطلاح ہے جو مردِ

---

[1] یعنی درسگاہ قائم کرنے کا۔ (طلوعِ اسلام) [2] اس کا انتظام ادارہ کے زیرِ غور ہے۔ (طلوعِ اسلام)

عورت دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم آپ قرآنِ حکیم کی روشنی میں کلامِ اقبال کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں اقبال جو بظاہر شاعر تھا درحقیقت مفکرِ قرآن تھا۔ چنانچہ اس کا پیام قرآنِ کریم کی تعلیم کی تفسیر ہے جس کی شہادت وہ خود یہ کہہ کر دیتا ہے کہ ؎

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام　　　شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

اسی طرح اقبال یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا مسلسل درس، قرآن کی آیات بینات سے لیتا اور اپنی قوم کو دیتا ہے۔ پہلے یقینِ محکم کو لیجئے کہ یہ کیا شے ہے۔ قرآن کے نزدیک اس کی کیا اہمیت ہے اور مومن کی زندگی کا اس سے کیا تعلق ہوتا ہے! آپ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ عزیز کے پہلے ہی پارے میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کا آغاز ان آیاتِ جلیلہ سے کیا گیا ہے جن کا مفہوم یہ ہے کہ تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو وہ ہمارے اس ضابطۂ قوانین کے اندر محفوظ ہے جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن۔ یہ ضابطۂ قوانین سفرِ زندگی میں ان لوگوں کو انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہیں اور صحیح روش کے ان نتائج پر بھروسہ رکھتے ہیں جو اگرچہ ابتداءً ان نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن جن کا آخرالامر سامنے آ جانا یقینی ہوتا ہے۔ یہ ہے یقینِ محکم کے متعلق قرآن کا قول فیصل اور اسی عصائے قرآنی کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے مومنین عملِ پیہم کی راہ خارزار پر قدم رکھ کر منزلِ مقصود کی طرف گامزن رہتے ہیں۔ اس عصا کی موجودگی سے نہ ان کو کبھی خوف و حزن ہوتا ہے نہ وہ کہیں مایوس و پاشکستہ ہوتے ہیں۔ اسے یقینِ محکم کہئے یا ایمانِ کامل! یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ یعنی یہ کہ ایمان خود یقین ہی کا نام ہے اور یقین ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یقین ایمان کے نتائج کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایمان کا مطلب ہے کسی پر اعتماد کر کے اس کی بات کو صحیح مان لینا اور یقین کے معنی ہیں علم و تحقیق کے بعد اس بات کا ثابت ہو جانا اور اس کا محسوس واقعہ کی شکل میں سامنے آ جانا۔ ارشاد باری ہے۔ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ۔ تم اسے یقین کی نظروں سے دیکھ لو گے۔ قرآنِ کریم نے جب مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت یعنی مستقبل پر یقین رکھتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی سعی و عمل کے مطلوبہ نتائج ان کے سامنے آ جاتے ہیں۔ یعنی پہلے وہ نظامِ خداوندی کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ اس نظام کو قائم کر لیتے ہیں تو اس کے بدیہی نتائج مرئی اور محسوس شکل میں ان کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا ایمان یقین میں بدل جاتا ہے۔

یوں خدا کے بندوں کا ایمان و ایقان سے جو واسطہ ہوتا ہے اور عمر بھر رہتا ہے اس کی شہادت قدم قدم پر قرآنِ کریم کی آیات سے ملتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔ یہ ضابطۂ قرآن جو تمہیں دیا گیا ہے، تمام

نوع انسانی کے لئے علم و بصیرت کی شمع نورانی ہے اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقت پر یقین رکھیں، زندگی کی صحیح منزل کی طرف رہنمائی اور انسانیت کی نشو و نما کا ذریعہ۔ سورۃ عصر میں زمانے کو گواہ ٹھہرا کر کہا گیا ہے کہ انسانیت کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انسان کی کوششیں وحی کی روشنی کے بغیر ہمیشہ ناکام رہتی ہیں۔ صرف وہی لوگ کامیاب و کامران ہوتے ہیں جو خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولِ حیات کی محکمیت پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن صرف یقین ہی نہیں رکھتے کیونکہ محض یقین رکھنا تو نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ یقین رکھ کر وہ قرآن کی غیر متبدل اور اٹل اقدار کے مطابق ایسے کام کرتے ہیں جو انسانوں کے اُلجھے ہوئے معاملات کو سنوار دیں اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کر دیں جس سے تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہو جائے۔ قرآن حکیم کی یہ رہنمائی ہمیں بتاتی ہے کہ مومنین کا یقین محکم رکھنے سے مقصود ہی یہ ہے کہ اس کے تابع رہ کر عمل پیہم اختیار کیا جائے کہ اس کے بغیر نظامِ خداوندی کے قیام کی اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا۔ ہر چیز کی بقا عمل سے ہے۔ انسان کا تمام تر سرمایہ عمل سے ہے۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ خدا کا اٹل فیصلہ ہے نتائج عمل سے پیدا ہوتے ہیں، عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لائحۂ عمل قرآن نے تجویز کیا ہے اس کی رُو سے ایک مومن کی تمام زندگی غیر منقطع سعی و عمل، مسلسل جہاد و جہد، ان تھک کوشش، کوہ شکن عزم، غیر متزلزل استقامت کی واضح تصویر ہوتی ہے۔ سنئیے! قرآن کیا کہتا ہے۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کئے۔ یعنی ایمان لائے اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے جو حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔ ان سے ان کی برائیاں دور کر کے ان کی حالت کو بہترین بنا دے گا۔ برعکس اس کے وہ ایمان یا یقین جو خالی الفاظ کا مجموعہ سمجھ لیا جائے اور جس کی تصدیق اعمال صالحہ سے نہ کی جائے برف کا ایسا تودہ بن جاتا ہے جو رگوں میں دوڑنے والے خون گرم کے ہر قطرہ کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔

مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

قرآن کریم میں پھر ہر جگہ فلاح و بہبود اور سعادت و کامرانی کے لئے جہاں اٰمَنُوا آیا ہے اس کے ساتھ ہی عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بھی موجود ہے۔ اور ایمان وہی ایمان ہے جو قرآن کے مطابق ہے۔ اور عمل وہی صالح ہے جسے قرآن صالح قرار دے۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں قانون خداوندی کی ابدی صداقتوں کا یقین اور اس کی محکمیت پر بھروسہ رکھے۔ اور مت بھولیئے! کہ وہ قول، وہ زبانی دعویٰ، وہ اقرار، وہ اصطلاحی ایمان، جس کی تائید آپ کے اعمال سے نہیں ہوتی، جس کی تصدیق آپ کے قلوب اور جوارح نہیں کرتے۔ قرآن کی میزان میں ایک پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا ایسا زبانی دعویٰ جرمِ عظیم بن جاتا ہے۔ کَبُرَ

مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۔ اللہ کے نزدیک یہ بہت بُری بات ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جو کر کے نہ دکھاؤ۔

یقینِ محکم اور عملِ پیہم کے حامل تو وہ ہوتے ہیں جن کی تعریف قرآن میں یوں کی گئی ہے
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۔
یقیناً وہ مومن ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر ان کے ایمان میں ذرا جنبش نہ ہوئی اور انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے اموال و نفوس سے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ اس کے علاوہ، قرآن یہ تشریح بھی کرتا ہے کہ جو کوئی عمل صالح کرے گا وہ مرد ہو یا عورت مگر اس شرط کے ساتھ کہ مومن ہو تو ہم...... اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور جو اچھے کام ان سے...... عمل میں آتے ہیں ان کا اجر دیں گے۔ یہ وہی اجر تو ہے جسے اقبال نے محبت فاتحِ عالم سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی آبدار شمشیریں جب دلوں میں اترتی ہیں، تو ان کو چیر نہیں ڈالتیں، بلکہ سراپا محبت بن کر ان کے اندر سما جاتی ہیں اور یوں دل جیت کر یہ انسانیت کے یہاں وہاں بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹ کر ایک مرکز پر لے آتی ہیں۔ جس کا درخشاں نتیجہ پوری عالمگیر انسانیت کا ایک اور صرف ایک امت بن جانا ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ کے پروگرام کی تکمیل ہوتی ہے۔ محسنِ انسانیت رحمۃ اللعالمین نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ سارا فلسفۂ حیات ایک جملے میں بیان فرما دیا۔ یہی وجہ تھی کہ حضور اکرمؐ کے عہد مبارک میں نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے یقینِ محکم رکھنے اور عملِ پیہم کرنے والوں کے دل ولولوں سے معمور، یقین کی دولت سے بھرپور تھے۔ خون میں حرارت تھی۔ آنکھوں میں چمک۔ خاک کے ایک ایک ذرے میں نویدِ حیات درخشندہ۔ موت میں حیات کے سامان خوابیدہ۔ سارا ماحول زندگی سے زندہ و تابندہ۔ پھر کیوں نہ فتح و ظفر ان کے پاؤں چومتی؟ سعادت و کامرانی کیسے نہ ان کی رکاب تھامتی؟ منزل کی تابناکی ان کی شمعِ راہ تھی۔ قدم ان کے لذتِ جادہ پیمائی سے محوِ خرام ——— وہ سپاہیانہ معاشرہ جس کے افراد اَلسّٰبِقُوْنَ بِالْخَيْرٰتِ کے مصداق، حسنِ عمل میں آگے بڑھنے والے۔ وہ سب کے سب ایمان و عمل کی مکمل و زندہ تفسیر تھے۔

سامعین عزیز! ایک طرف یہ مذکورہ قائم و دائم چمکتے دمکتے حقائق ہیں اور دوسری طرف ہماری تیرہ و تار قوم ہے۔ ہمارا اندھا و بہرا معاشرہ ہے۔ ہماری گم کردہ راہ نوجوان نسل ہے۔ اور ان سب پر بھاری ہماری خود فریب ذات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں بھی بلکہ ہمیں ہی مومنین ہونے کا دعویٰ بھی ہے۔ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ہمیں قرآنی محفل کے حاضرین ہونے کا شرف بھی

حاصل ہے۔ پھر یہ تضاد کیوں؟ اس لئے کہ ہمارا سارا ایمان، ہمارا سارا دین، سمٹ سمٹا کر چند الفاظ کی ادائیگی کا نام رہ گیا ہے۔ بہ زعم خویش ہماری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ دین کی، ایمان و یقین کی باتیں مختلف الفاظ میں، مختلف انداز سے کہتے رہیں۔ کرنے کا کام ہمارا نہیں۔ گویا ہمارے نزدیک اس کے لئے اللہ کے فرشتے، اللہ کی کائناتی قوتیں بہت کافی ہیں۔ مگر تلخ حقیقت یہ ہے کہ جب قلوب دولتِ یقین سے خالی رہیں۔ نگاہیں نورِ بصیرت سے محروم ہوں۔ بازو قوتِ عمل سے بیگانہ ہو جائیں۔ دماغ تخلیق مقاصد کی متاعِ گراں مایہ سے عاری ہوں۔ افکار پریشان، جذبات عقل و فہم سے گریزاں رہیں، تو پھر ایسے افراد کے ہاتھوں اس جہانِ نو کی تعمیر کیونکر ممکن ہے جس کی بنیاد یقینِ محکم پر اٹھتی ہے اور جس کی عمارت عملِ پیہم سے بلند و بالا ہوتی ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

یقین افراد کا سرمایہ تعمیرِ ملت ہے!
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اِدھر ہمارے ہاں کی شکستہ دلی و بے ہمتی پر استوار فضا میں بے یقینی کا اضطراب ہماری نوجوان نسل میں نمایاں نظر آتا ہے اور اس پر انتشار کیفیت ذہنی کے سبب، آج کے جوان اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ زمانہ آگے بڑھ رہا ہے۔ ترقی یافتہ قومیں مزید ترقی کر رہی ہیں۔ لیکن ہم پس ماندہ اس لئے ہیں کہ صدیوں پرانی اقدار اور گھسے پٹے اصول و ضوابط کو نہیں چھوڑتے۔ ہم ترقی نہیں کر سکتے جب تک ہم ان اقدار کی زنجیروں سے آزاد ہو کر نئی اور بدلتی قدروں کو نہ اپنائیں گے۔ سنا آپ نے! یہ بدلتی قدروں کی اصطلاح بھی خوب ہے کہ جس کی تشریح ہی نہیں ہو پاتی۔ جب سوال کرو جواب ملے گا؟ "آپ بدلتی قدریں نہیں سمجھتے۔ حیرت ہے۔ بھئی یہی بدلتی قدریں!" چلئے بات ختم۔ مگر حق تو یہ ہے کہ انسان کے خود ساختہ اصول و اقدار کو تو یقیناً بقا نہیں۔ وہ تو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہی رہتے ہیں۔ آج کچھ، کل کچھ۔ یوں بننا اور مٹنا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمیں ان بدلتی قدروں کے پیچھے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس تو خدا تعالےٰ کی وہ ہمیشہ رہنے والی کتاب ہے جو اُن مستقل اقدار، محکم اور غیر متبدل اصولوں کی حامل ہے جن کو کبھی فنا نہیں۔ اس لئے خدا کی عطا کردہ اقدار کبھی کسی زمانے میں بھی پرانی نہیں ہو سکتیں، وہ ہمیشہ نئی رہیں گی۔ اور قوانینِ خداوندی کبھی نہیں بدلا کرتے، وہ تاقیامت ہم انسانوں کی رہبری کے لئے دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا قرآنی ممکنات سے مایوسی حقائق سے چشم پوشی ہے۔

اقبال نے قرآن کا پیغام ہمارے سامنے کھول کھول کر بیان کیا ہے تو اس لئے کہ دنیائے انسانیت کا مستقبل صرف قرآن سے وابستہ ہے۔ اسی لئے انسانیت کا نصب العین بن کر رہنا ہے۔ اس کے سوا زندگی کے مسائل کا کوئی اور حل ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا اقبال کا یہ شعر دراصل جماعتِ مومنین کا منشائے حیات ہے، تو اس تعلق سے یاد رکھئے کہ جس یقینِ محکم و

عملِ پیہم کا نتیجہ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت کے قیام کی صورت میں نہیں نکلتا۔ بالفاظِ دیگر جماعتِ مومنین کا استخلاف فی الارض نہیں۔ اور ضابطۂ الٰہی کے مطابق جہاں بینی و جہاں رانی نہیں کی جاتی، وہ ایمان، وہ یقین قرآنی نہیں۔ وہ اعمالِ اسلامی نہیں۔ انہیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے۔ نگاہ کا پھیر ہے۔ مسلمان کے لئے ایمان و عمل کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے۔ باقی سب فریبِ نظر، ابلیس کے دھوکے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں ہماری ہستی قائم رہے تو آیئے! ایمانِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم بھی پیدا کریں، کہ یہی سچے مومنوں کی نشانی ہے۔ اور سچائی، اقبالؔ ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامین پیدا

والسلام

۵- اعجاز احمد

یقینِ محکم۔ عملِ پیہم۔ محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

محترمہ صدر صاحبہ! باباجی اور میرے بزرگ سامعین! السلام علیکم

مذکورہ بالا عنوان میں شعر کا دوسرا حصہ یعنی "جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں" خاصا غور طلب ہے۔ ذہن میں فوراً سوال پیدا ہوتا ہے۔ کونسا جہادِ زندگانی؟ اور کونسے مرد؟

ایک جہادِ زندگانی تو وہ ہے جس سے بڑے بڑے جابر حکمران فرعون اور چنگیز جیسے اپنی وسعتِ سلطنت کی ہوس میں ہمیشہ نسلِ انسانی کو تباہ و برباد کرنے کی جنگیں لڑتے رہے، اور وقت کے سرمایہ داروں اور گدی نشینوں کو قارونیت کے اصول سمجھا کر مال و دولت اکٹھا کرنے کا درس دیتے رہے۔ تاکہ بھوکی اور ننگی انسانیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجبور اور غلام رکھا جائے۔ ایسی حالت میں یقینِ محکم اور عملِ پیہم ان فرعونوں کی تلواریں تو ہیں لیکن یہ الٹی تلوار ہیں جو خیر کو کاٹ کر شر کو جنم دیتی ہیں اور نسلِ انسانی کی خودکشی کا بھی کام کرتی ہیں۔

حاضرینِ مجلس!..... معاف رکھنا علامہ محمد اقبالؒ کا کلام ہمیشہ انسان کے مثبت (POSITIVE) پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ اِن کے کلام کی شمشیریں فرعونیت اور چنگیزیت کی تلواروں سے ٹکراتی ہیں۔ ان کے پیغام کی رُو سے یقینِ محکم۔ عملِ پیہم اور محبت ایسے مردوں کی شمشیریں ہیں جنہوں نے جہادِ زندگانی میں خود ساختہ قیصریت اور خالقاہیت کے پردے کو چاک کر کے انسان کو سینکڑوں برس کی غلامی سے نجات دلائی ہے۔ اور تاروں کی دولت کو اس سے چھین کر ایک

ایسے مقام پر کھلا رکھ دیا ہے جہاں سے ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق حاصل کر سکتا ہے۔

سامعین! ان کی نظر میں تو جہادِ زندگانی سے یہ مراد ہے کہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جائے جس میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی احسن طریقے سے پوری ہوتی رہیں۔ کوئی کسی کا محتاج نہ ہو۔۔۔ انسان اپنی عقل کی تخلیقی صلاحیتوں سے پورا پورا کام لے کر اور عقلِ سلیم کو یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبت کے تابع رکھ کر زمان و مکاں سے ماورا۔ علم و ہنر کی روشنی میں۔ کاروانِ حیات کو ضابطۂ خداوندی کے ساتھ اس مقام تک لے جائے جہاں معراجِ انسانیت ہے۔ جہاں پر انسان صفاتِ خداوندی کا مظہر ہوگا۔ جہاں انسان کی شخصیت اور اس کی ذات کے تمام پہلو متوازن طریقے سے نشو و نما پائیں گے۔ اس میں کوئی بھی پہلو نظر انداز نہ ہوگا۔

یہاں ہر موڑ پر انسانیت کی رہنمائی ہوگی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فکرِ انسانی کسی کی غلام نہیں رہ سکتی۔ وہ ضابطۂ خداوندی کی روشنی میں اس طرح آگے بڑھتی جائے گی کہ تمام علاقائی تعصب، رنگ و نسل کا امتیاز۔ انفرادی اور اجتماعی شورشیں انسان کے خود ساختہ معاشی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی قدریں خود بخود گر جائیں گی۔ اور ان کی جگہ وحی کا عطا کردہ نظامِ خداوندی قائم ہو جائے گا۔ جس میں انسانی اقدار کا بول بالا ہوگا۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ

یہاں پر کسی کو کوئی خوف اور ڈر نہ ہوگا۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

میرے بزرگ بھائیو اور بہنو۔ یہ ہے وہ معاشرہ جس کی تکمیل کے لئے جہادِ زندگانی میں یقینِ محکم۔ عملِ پیہم اور محبت ان مردوں کی شمشیریں ہیں جو خشکی و تری کی فساد انگیزیوں میں داعی انقلاب بن کر اپنی دعوتِ انقلاب لے کر اٹھتے ہیں اور سہل انگاری کی زندگی کا پیدا کردہ قیصریت اور خانقاہیت کا وہ بُت پاش پاش کر دیتے ہیں جس میں سعی و کاوش اور فکری صلاحیتیں معطل ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا۔ یہاں یقینِ محکم۔ عملِ پیہم اور محبت نہ صرف مردِ حُر کی شمشیریں بنتی ہیں بلکہ مردِ مومن کا ترانہ بھی جس میں دعوتِ حق بھی ہوتی ہے۔ اور منزل کا تعین بھی۔ یہ داعی انقلاب مخالفتوں کے اس ہجوم اور مزاحمتوں کی اس یورش میں بھی اپنی اس دعوتِ حق کو برابر جاری رکھتے ہیں کہ نصرتِ خداوندی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ثابت قدمی ان کا بہت بڑا خاصا ہوتی ہے۔ قرآن اس بارے میں ان کو کہتا ہے۔

تم بھی اسی طرح ثابت قدم رہو جیسے تم سے پہلے پیغمبر ثابت قدم رہے۔ ان کے لئے مکافاتِ عمل میں جلدی نہ کرو۔

حاضرینِ مجلس! چونکہ ایسے لوگوں کو اپنے اعمال کے ثبت نتائج مرتب ہونے کا پورا پورا یقین ہوتا ہے

اور ان کو کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہوتا۔ لَا رَیْبَ فِیْہِ اس لئے یہ لوگ آہستہ آہستہ بڑھے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں نصرتِ خداوندی ان کو پکارتی ہے کہ:۔
"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ جبکہ ابھی تم نے سعی و عمل کے میدان میں قدم بھی نہیں رکھا۔ اِن لوگوں کی طرح جن کو سختیاں اور تکلیفیں پیش آئیں۔ مولناکیوں سے اِن کے دل دہل گئے۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسُول اور ایمان والے (داعی انقلاب) پکار اٹھے اور نصرتِ الٰہی تیرا وقت کب آئے گا۔ خدا کی نصرت یہ کہتی ہوئی اپنے وقت پر نمودار ہو گئی کہ گھبراؤ نہیں! خدا کی نصرت تم سے دُور نہیں ہے" ($\frac{2}{214}$)

معزز حاضرین اور میرے بزرگو!

تاریخ بشریت کشمکشِ حیات۔ حق و باطل کی جنگ اور خیر و شر کے ٹکراؤ سے بھری پڑی ہے۔ خود پیدائشِ آدمیت اِس خیر و شر کے ٹکراؤ کی ابتداء ہے۔ زندگی جب مختلف تخلیقی مراحل سے گذر کر بشریت کے لباس میں رونما ہوئی تو کائناتی قوتوں کو اِس کے سامنے جھک جانے کو کہا گیا۔ جس سے قصۂ ابلیس و آدمؑ نے جنم لیا۔ اس طرح حق و باطل معیاری سامنے آیا۔ یوں حرکتِ آدمیت کو خیر و شر کے ترازو میں تولا جانے لگا۔ جس سے فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کا امتحان شروع ہوا۔ بعد میں یہی امتحان اس کی معراج بنی اور یہی امتحان اس کی خودی کا راز۔ اس راز کو خود انسان نے داعی انقلاب بن کر اپنے آپ پر ظاہر کرنا تھا۔ جس کے لئے عمل پیہم۔ یقینِ محکم ضروری صفات قرار پائیں۔ ضابطۂ خداوندی کو چونکہ انسانی ہاتھوں سے ظہور پذیر ہونا تھا۔ اس لئے خدا کا ترجمان بننے کا شرف بھی اسی کو حاصل ہوا۔ اس کیفیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا!

معزز حاضرین!

غور کیجئے! یہ امتحان خود حضرتِ انسان سے ہی کیوں مخصوص کیا گیا۔ جبکہ دیگر تمام مخلوق اس سے بری الذمہ قرار پائی۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ یہ حضرتِ انسان اختیار و ارادہ کے مالک جو ٹھہرے۔ عقل و شعور۔ فکر و جذبات۔ غور و فکر۔ اچھائی و برائی کی تمیز۔ علم و ہنر۔ دنیائے تصورات اور دنیائے حقیقی کے مالک جو بنائے گئے۔ جب کوئی چیز اختیار و ارادہ کی مالک بن جائے تو اس پر امتحان فرض ہو جاتا ہے۔ اس امتحان میں خیر و شر کا ٹکراؤ ہوتا ہے جس سے کاروانِ حیات کو اپنی منزل کی صحیح سمت میں بڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ یوں انسانی زندگی خیر و شر کے اس ٹکراؤ میں ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، علم و عقل۔ سعی و کاوش۔ عمل پیہم اور یقین محکم کے ساتھ معراجِ انسانیت کے انتہائی بلند مقام کو جا پہنچتی ہے۔ یہ وہی مقام ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبالؒ نے کہا ؎

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

صدر صاحبہ اور معزز حاضرین!

مردِ قلندر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، معراجِ انسانیت کے اس مقام کو خوب جانتے تھے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ یہ معراجِ انسانیت ہی حاصل شدہ چیز نہیں اور نہ ہی یہ ایسا مقام ہے۔ جو خیرات کے طور پہ مل جائے۔ یہ تو جدوجہد، محنت، سعی و کاوش کی ایک طویل داستان ہے جس پہ پہنچنے کے لئے کاروانِ حیات کو بڑی بڑی فولادی چٹانوں سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ چٹیل میدانوں۔ تپتے ریگستانوں۔ بیاباں جنگلوں۔ تنگ و تاریک وادیوں۔ تلاطم خیز سمندروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کاروانِ حیات کو اپنی منزل کے مل جانے کا پختہ یقین نہ ہو اور یہ متواتر اپنا سفر جاری نہ رکھے تو یہ کارواں راستہ سے بھٹک کر کسی گمنام وادی میں گم ہو جائے گا۔ اور اس کو کبھی اپنی منزل نہ ملے گی۔ لہٰذا یقینِ محکم۔ عملِ پیہم۔ اس کی صرف شمشیریں ہی نہیں بلکہ چراغِ منزل بھی ہیں اور مشعلِ راہ بھی۔ ایسی کٹھن منزل طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ شمشیریں باطل کی قوتوں کو جو اس کا راستہ روکنے کے لئے آگے بڑھیں کاٹتی رہیں۔ اور یہ چراغِ منزل و مشعلِ راہ بن کر اس کو تنگ و تاریک اور خوفناک وادیوں سے نکال کر صحیح راستہ پہ گامزن کر دیں۔ ایسے مقام پہ اس کاروانِ حیات کو سیرتِ فولاد پیدا کرنا ہوگی۔ جب یہ کٹھن منزل گزر جائے اور اس کا سفر گلستان میں شروع ہو تو اسے محبت و اخوت کا مجسمہ بننا ہوگا۔ ایسے سفر کو علامہ اقبال نے کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا!
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

معزز حاضرین اور باباجی! حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں۔ اسلام کی رو سے۔ انسانی ذات (خودی) کے اثبات و تکمیل کا طریق یہ ہے کہ انسان اپنے جوشِ عمل اور شدتِ کردار سے عالمِ طبعی کو مسخر کرے۔ اور بے پناہ قوتوں کو منشاءِ ایزدی کے مطابق کام میں لائے۔ اسلامی تصورِ زندگی کا راز حرکتِ دوام۔ عملِ پیہم اور یقینِ محکم میں ہے۔ یہ حرکتِ دوام ایک جہانِ نو تعمیر کرتی ہے۔ جس میں ہر چیز قوانینِ خداوندی کے تابع اپنی اپنی جگہ سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ پھر انسانی محنت و کاوش اور ارادے کی پختگی کے ساتھ نظامِ زندگی کے درخشندہ نتائج کی بشارت ہوتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "ہمارا قانون یہ ہے کہ ہم رسولوں کو اس لئے بھیجتے ہیں کہ ایمان و عمل کی برکتوں کی خوشخبری سنائیں۔ اور برے عملوں کے نتائج سے ڈرائیں۔ پھر جو کوئی یقین لایا۔ اپنے اندر صلاحیتِ عظیم (یقینِ محکم۔ عملِ پیہم۔ اور محبت) پیدا کی تو اس کے لئے کوئی غم اور اندیشہ نہیں۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے ہماری یہ نشانیاں جھٹلائیں تو وہ ضروری ہے کہ ہمارے عذاب کی لپیٹ میں آ جائیں"۔

حاضرینِ مجلس! آپ نے دیکھ لیا کہ حرکتِ دوام عملِ پیہم اور یقینِ محکم کے کیسے کیسے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

اور خود خدا وحی کے ذریعے بشارت دیتا ہے کہ ایسے شخص کو کوئی غم نہیں اور نہ فکر ہے۔ اس کے برعکس؛ تن آسانی، سہل انگاری کی زندگی میں ذہن کی فکری صلاحیتیں معطل ہو جاتی ہیں۔ مجاہدانہ روش معیوب نظر آتی ہے۔ یہ لوگ سرمایہ داروں کی شکل میں، جاگیرداروں اور گدی نشینوں کے بھیس میں، دوسروں کی کمائی سے اپنی عیش پرستی کے سامان فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح یہ دو قسم کے گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک تو مجرمین کہلاتے ہیں جو اپنی کثرتِ اولاد اور کثرتِ مال پر نازاں ہوتے ہیں اور دوسرے اربابِ مذہب جو اسلاف پرستی کے مقدس نقاب پہن کر حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ تاریخِ عالم نے دعوتِ انقلاب کی مخالفت انہی دو گروہوں سے ابھرتی نظر آئے گی۔ لبا اوقات یہ دونوں گروہ مل کر متحدہ محاذ قائم کر لیتے ہیں۔ جاگیرداری (قیصریت) اس کی مخالفت کے لئے دولت مہیا کرتی ہے۔ جبکہ خانقاہیت، آباء و اجداد اور اسلاف کے اتباع کا واسطہ دیتی ہے۔ راجہ برہمن کی حفاظت کرتا ہے۔ اور برہمن بادشاہ کو اوتار قرار دے کر اسے دھرم کا محافظ بتاتا ہے۔ اس طرح ان دونوں کی ملی بھگت انسانی حقوق کو پامال کر دیتی ہے۔ اور انسانیت، ان کی غلامی میں ابدی تنگی تڑپتی رہتی ہے۔

حضرات! اس مقام پر مردِ حر اپنی عقل و شعور، تدبر و تعقل، فکر و جذبات اور علم و ہنر کو ضابطہ خداوندی کے تابع رکھ کر آگے بڑھتا ہے۔ اور ان دونوں کی ملی بھگت کو پاش پاش کر کے ان کے خود ساختہ اتحاد پر یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی تیز تلواروں سے کاری ضرب لگاتا ہے۔ اور پھر یہ فرعونی طاقتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دم توڑ دیتی ہیں۔ یہ مردِ حر انسانیت کے غصب شدہ حقوق، ان طاقتوں سے چھین کر اس مقام پر رکھ دیتا ہے جہاں ان کی تقسیم صحیح عدل و انصاف کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ مردِ حر یا داعیِ انقلاب جو یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا حامل ہوتا ہے سیرت و کردار اور تقویٰ کی خصوصیات میں بھی لاثانی ہوتا ہے۔ جو انقلاب اس کے ہاتھوں سے معرضِ وجود میں آتا ہے اس میں خارجی قوتوں کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اور داخلی قوتوں کی بھی۔ کیونکہ اگر خارجی / مادی قوتوں کو قوانینِ خداوندی سے الگ کر دیا جائے تو اس میں چنگیزیت جنم لیتی ہے۔ اگر صرف داخلی قوتوں کو ہی لیا جائے تو یہ رہبانیت بن جاتی ہے۔ اگر ان دونوں کو یکجا جمع کر دیا جائے تو دینِ اسلام یا بقولِ اقبالؒ مردوں کی شمشیر ہے۔

اس لئے قرآن نے کہا ہے "مسلمانو! جہاں تک تمہارے اختیار میں ہے قوت، گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کرو۔ اور پھر مستعد رہ کر اور عملِ پیہم کے ذریعے تم کلمۂ حق کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو۔ یاد رکھو! اللہ کی راہ میں جو تم خرچ کرو گے پورا پورا مل جائے گا۔"

خواتین و حضرات! حاضرینِ مجلس اور پاک سرزمین کے باسیو! خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ، انقلاب کا مرغِ سحر تمہیں پکار رہا ہے۔ طلوعِ آفتاب کی کرنیں تمہارے چہروں کو منور کر رہی ہیں۔ اور آنے والا روشن دن کی اشارت دے رہی ہیں۔ وقت کا براق تمہیں معراجِ انسانیت پر پہنچانے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ خطۂ پاکستان نظامِ خداوندی کو عملی شکل میں دیکھنے کا متمنی ہے۔ تمہارے فرض کی پکار تمہاری منزل

کا تعین کر رہی ہے۔ نصرتِ خداوندی پکار پکار کر تمہاری منزل کے نزدیک ہونے کا یقین دلا رہی ہے۔ سب مل کر عہد کریں۔ یہ عہد کسی کے ساتھ نہیں عہد اپنے ضمیر سے، خود اپنی ذات سے، خود قرآن سے کہ ہم نے طلوعِ اسلام کے مشن کو آگے بڑھانا ہے۔ یہاں تک آگے لے جانا ہے کہ شرفِ انسانیت کا براق معراجِ انسانیت پر پہنچ جائے۔ اَوْ اَدْنٰی (اس سے بھی زیادہ نزدیک) اور یہ کہ یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبت کی تیز تلواروں سے ان تمام باطل قوتوں کو کاٹ کر رکھ دیں جو اس جہانِ زندگانی میں تمہارا راستہ روکنے کی کوشش کریں۔ اور اس طرح تم بڑے فخر سے علامہ اقبالؒ کے حضور حاضر ہو کر بابا جی سے یہ کہہ سکو گے کہ ہم نے تیرے کلام یعنی یقینِ محکم۔ عملِ پیہم اور محبت کی صحیح عملی تعبیر پاک سرزمین کے باسیوں کو دکھلا دی ہے۔

آخر میں میں اپنے بابا جی سے یہ کہتے ہوئے رخصت چاہوں گا کہ:۔

بابا جی: تیرے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

United PTI 5/76

حیاتِ قائدِ اعظمؒ

کے

نمایاں خط و خال

(۵)

(اس سلسلہ کی چوتھی کڑی، طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں بات، سنہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان تک پہنچی تھی۔ اب اس کے بعد کے واقعات ملاحظہ فرمائیے۔)

قراردادِ پاکستان کے منظرِ عام پر آنے کے بعد، چھ ماہ کی مختصر سی مدت میں، ملّتِ اسلامیہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ صدیوں کے بعد ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ نو کروڑ مسلمان ایک قائد کے اشارے پر ایک نشانِ منزل اور ایک نصب العین کو لئے ہوئے آزادی اور استقلال کی راہوں میں سرگرمِ تگ و تاز تھے۔ مدتوں کے بعد پہلی دفعہ انہوں نے اپنی جداگانہ قومی حیثیت کی وجہ جواز دنیا کے سامنے پیش کی تھی اور اسی اساس پر اپنے لئے ایک جداگانہ مملکت کے حصول کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا تھا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ برطانوی حکومت انتقالِ اختیارات کے دوران اس حقیقتِ ثابتہ سے گریز کی راہیں اختیار کر سکے۔ کانگریس یا کسی دوسری طاقت سے مرعوب ہو کر ملّتِ اسلامیہ کے حق خود ارادیت سے انکار، اب اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ ایسا اقدام اس قوم کی غیرت کے لئے ایک مستقل چیلنج ہوتا جو صدیوں تک یہاں حکومت کر چکی تھی اور اب پھر ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے اپنی آزادی کا مقام متعین کر چکی تھی۔

سیاسیاتِ ہند کی اس تبدیلی نے کانگریس کے سارے منصوبوں کو خطرے میں ڈال دیا اور بالآخر اس نے (انفرادی) ستیہ گرہ کا حربہ ... لانے کی سعی کی۔ ستیہ گرہ کی یہ ملک گیر تحریک اس خوش فہمی میں شروع کی گئی کہ جنگ کے دوران اس داخلی انتشار سے مرعوب ہو کر برطانوی حکومت کانگریس کے مطالبات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے گی۔ لیکن ملّتِ اسلامیہ اپنے عظیم قائد کی قیادت میں اب اس مقام پر کھڑی تھی جسے نظرانداز کرنا انگریز کے بس کا روگ نہیں تھا۔

نومبر ۱۹۴۰ء میں اس مہم کا آغاز کرتے ہوئے مشہور کانگرسی رہنما مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے گاندھی جی سے مشورہ کے بعد مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ان کے راستے میں رکاوٹ نہ پیدا کریں۔ تحریک کا آغاز ہوتے ہی قائدِ اعظم

کو حربک کالج دہلی میں خطاب کا موقع ملا اور انھوں نے اس تحریک اور ڈیسائی کی اپیل کا تجزیہ کرتے ہوئے حقائق کے چہرے سے نقاب اُلٹ دیا۔ انھوں نے فرمایا۔

کانگریس کو اپنے طریق کار کے مطابق جنگ لڑنے دیجیے! لیکن کیا میں کانگریس ہائی کمان سے — جس کے ایک رکن مسٹر ڈیسائی بھی ہیں — وہ اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے قائد بھی ہیں — یہ پوچھ سکتا ہوں کہ برطانوی حکومت کے خلاف آخر کانگریس کے جنگی مقاصد کیا ہیں؟ ہمیں تو کانگریس کے جنگی مقاصد یہی نظر آتے ہیں کہ ہر ممکن طریق سے حکومت پر دباؤ ڈال کر اسے مجبور کر دیا جائے کہ وہ ہماری اہمیت کو نظر انداز کر کے ہمیں بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ یہ ہے کانگریس کا مقصد۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر خود فریبی کی یہ پالیسی کیوں؟ ہم حتی الامکان مبتلائے فریب نہیں ہوں گے۔ (تقاریر جناح۔ جلد ۱، صفحہ ۲۰۱)

مرکزی اسمبلی کی اہم تقریر

۱۹ نومبر سنہ ۱۹۴۳ء کو میزانیہ پر بحث کے دوران قائداعظمؒ کی اہم تقریر مرکزی اسمبلی کے ایوان میں غلغلہ انداز ہوئی۔ اس تقریر کا شمار قائداعظمؒ کی اہم ترین پارلیمانی تقاریر میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اس طویل اور پرزور خطاب میں پورے دلائل و براہین سے مسلح ہو کر سرکاری اور کانگریسی بنچوں کو چیلنج کیا اور بالخصوص راج گوپال اچاریہ کی "پرخطر پیش کش" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:-

مسٹر راجگوپال اچاریہ نے ایک پرخطر پیش کش کی ہے۔ ہمارے لائق و فائق نمائندگان صحافت بھی جن کی ایک فوج کی فوج میں یہاں دیکھ رہا ہوں ہم سے مسلسل پوچھ رہے ہیں کہ مسٹر اچاریہ کی پیش کش پر کیوں توجہ نہیں دی جا رہی۔ لیکن وہ پیش کش ہے کہاں؟ (اس پیشکش کا اقتباس پیش کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے مسٹر اچاریہ کے یہ الفاظ دہرائے۔)

"اقلیتوں کی مشکلات کے سلسلے میں میں مسٹر ایمری کو جواباً یہ پیش کش کروں گا کہ اگر ملک معظم کی حکومت ایک ہنگامی نیشنل گورنمنٹ کی تشکیل پر آمادہ ہو تو میں کانگرسی رفقاء کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ ایک وزیر اعظم نامزد کرے اور اسے ایک مناسب قومی حکومت متشکل کرنے کا موقع دے۔"

تو پھر جناب والا! اچھے ہونے والے وزیر اعظم (قائداعظمؒ) کو گفت و شنید کی دعوت دینے کے بجائے وہ (مسٹر اچاریہ) ڈیلی ہیرالڈ کو گھسیٹ مارتے ہیں کہ میں مجلس عاملہ کے رفقاء کو یوں منا لوں گا اور یوں راضی کر لوں گا ——— میں اپنے معزز دوستوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس طریق کار کو درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ (ایضاً)

پھر انھوں نے مسٹر اچاریہ کی پیش کش کے یہ الفاظ دہرائے:-

مسٹر جناح کو ابتداء میں یہ پیش کش کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ بجا طور پر اسے اپنی ہتک خیال کرتے ہوئے یہ دندان شکن جواب دے سکتے تھے کہ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوں۔ (ایضاً)

اور پھر اس حقیقت کا جواب دیتے ہوئے قائداعظم نے کہا۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر مسٹر ایریے اسے قبول کر لیتے اور اس کے بعد لازمی طور پر مجھے یہ پیشکش کی جاتی تو کیا اس وقت بھی اس کا وہی دندان شکن جواب نہیں ہو سکتا تھا؟ مسٹر اچاریہ کے خیال کے مطابق میرا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ "مسٹر ایریے اور مسٹر راج گوپال اچاریہ دونوں میری ہتک کر رہے ہیں۔ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا ہوں" کم از کم دوسروں کے فہم و ادراک سے تو حسنِ ظن رکھو۔ (ایضاً)

بظاہر کتنی بڑی دلفریب پیش کش تھی جو قائداعظمؒ کو کانگرس کی طرف سے کی گئی۔ یعنی انہیں نیشنل گورنمنٹ میں کابینہ کی تشکیل اور وزیراعظم کے تقرر کا حق دیا جا رہا ہے۔ یہ پیش کش بہت بڑا امتحان تھا۔۔۔ ایک کڑی آزمائش تھی ایک عظیم قائد کے تدبر اور فراست کی۔ کوئی دوسرا لیڈر ہوتا تو یقیناً کسی خوش فہمی کا شکار ہو کر اسے فوراً قبول کر لیتا اور خوشی سے جامے میں پھولا نہ سماتا۔ لیکن قائداعظم کی عقابی نگاہیں مکر و فریب کے زریں نقابوں میں مضمر فتنوں کو بھانپنے کی پوری صلاحیتوں سے مالا مال تھیں۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ تشکیلِ حکومت کی یہ پیش کش حصولِ پاکستان کے سارے امکانات کو ملیامیٹ کر کے رکھ دے گی۔ چنانچہ مرکزی اسمبلی میں اس پیش کش کی تفصیل پیش کرنے کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص جچے تلے انداز میں فرمایا:۔

جمہوریت، جمہوریت، جمہوریت! اور ایک قومی حکومت!! اس سے کیا حاصل؟ کابینہ خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو وہ اسی مجلسِ دستور ساز کو جواب دہ ہو گی جس کے دو تہائی منتخب ارکان پر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اپنا اقتدار رکھتے ہیں۔

میں اس شخص کو قابلِ رحم سمجھوں گا جو ایسی کابینہ میں ہو اور کانگرسی احتساب اور اس کے حکم کی تعمیل نہ کرے۔ (ایضاً)

اور پھر اسی تقریر کے آخر میں حکومت اور کانگرس کے نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا۔

ہم نے آخری اور حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان ہمارا واحد نصب العین ہے ہم اس کی خاطر مسلسل جدوجہد کریں گے اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ کسی کو بھی اس بارے میں غلط فہمی نہ رہنی چاہیئے۔ جمہوری نظامِ حکومت کا جنازہ نکل چکا ہے۔۔۔ اس قسم کی جمہوریت کا جو مسٹر ڈیسائی کے پیشِ نظر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری تعداد کم ہو لیکن حکومت کو معلوم ہے۔۔۔ اور میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں۔۔۔ کہ اپنی کمیِ تعداد کے باوجود اگر ہم اس امر کا ارادہ کر لیں تو تمہارے لئے اس سے سو گنا زیادہ مشکلات پیدا کر سکتے ہیں جو کانگرس نے آج تک کی ہیں۔ یہ ایک دھمکی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جس سے میں تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ (ایضاً)

نوجوانانِ ملت سے خطاب

ایک سال کی مختصر سی مدت میں تحریکِ پاکستان کاروانِ ملت کے لئے ایک نشانِ منزل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ملک کے

ایک سرے سے دوسرے سرے تک افرادِ ملت کے دلوں میں ذوقِ سفر کی امنگیں اور ولولے انگڑائیاں لے رہے تھے۔ ملت کے ہزاروں نوجوان جو ایک سال قبل تک کانگرس کو آزادی کی علمبردار سمجھ کر اس کی پُرفریب اداؤں اور عشوہ طرازیوں سے لو لگائے بیٹھے تھے نقاب اٹھ جانے کے بعد اب اسے دشمن دین و آگہی پا رہے تھے۔ قائدِ اعظم کی دعوتِ فکر و عمل میں انہوں نے اپنی ملتِ عزیز کی نشاۃ ثانیہ کے سہانے خواب محسوس و مشہود حقائق میں اُبھرتے دیکھ لئے تھے اور فرض شناسیوں کا یہ احساس ان کے دلوں میں کروٹیں لے رہا تھا کہ اس کٹھن مرحلے پر انہیں اپنے بوڑھے قائد کے دست و بازو بننے کے لئے آگے بڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ تحریکِ پاکستان کو جنم لئے ابھی سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ پنجاب کے طلبا نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے اپنے آپ کو ایک مضبوط سلک تنظیم میں یکجا اور ہم آہنگ کر لیا اور یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو اپنی پاکستان کانفرنس لاہور میں، وہ ہزاروں کی تعداد میں اس وفورِ عزم سے قائدِ اعظم کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھے کہ اس کانفرنس پر شمع اور پروانوں کی انجمن کا گمان ہو رہا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کے تن میں ایک نئی زندگی رقصاں تھی جب انہوں نے اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

تاریخ کی ترتیب میں یہ ایک حیران کن حقیقت قرار پائے گی کہ تین سال کی مدت میں لوکروڑ مسلمانوں کی ایک جمعیت کیونکر ایک پلیٹ فارم کے گرد اور ایک پرچم کے سائے میں مجتمع ہو گئی ——— ایک ایسی حقیقت ہے جو آپ کو دو صدیوں سے دیکھنے میں نہیں آئی (تالیاں) یہ سب کچھ ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ چیز معرضِ وجود میں آ گئی۔

حصولِ پاکستان کی کٹھن منزل کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے ان گرم جوش نوجوانوں پر واضح کیا:

یاد رکھئے کہ یہ کوئی معمولی سا معاملہ نہیں۔ یہ ایک عظیم ترین مرحلہ ہے جو سلطنتِ مغلیہ کے زوال سے اب تک پہلی بار تمہاری زندگی میں سامنے آیا ہے۔ آپ کو جان لینا چاہیئے کہ اس کے لئے تمام ضروری وسائل اور تیاریوں کی ضرورت ہے تاکہ اس نصب العین کو حاصل کیا جا سکے۔ آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں گے کہ نہ تو جذبات کی رَو میں بہہ جایئے اور نہ تردد میں کھو جایئے۔ ایک قوم کی تعمیر کیسے ہوتی ہے؟ ایک زوال پذیر قوم کی بازآفرینی کی صورت کیا ہے؟ یہ ہیں اصل سوالات۔

آج ہم زوال یافتہ قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمیں بدترین دن دیکھنے پڑتے ہیں۔ تاہم میں آج مسرور ہوں کہ اس ملک میں ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ اور بازآفرینی کا روشن امکان نظر آ رہا ہے۔ ہم ابھی بمشکل بیدار ہوئے ہیں اور آنکھیں مل رہے ہیں۔ ہم میں ابھی یہ شعور اُبھرا ہے کہ اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالیں۔ ہماری کیفیت ابھی ایک مریض کی سی ہے۔ ہم ابھی لاچار ہیں۔ اس لئے پیشتر اس کے کہ آپ پوری طرح صحت مند، مضبوط اور سفر کے قابل ہوں آپ کو صحت یابی کا مرحلہ طے کرنا ہو گا۔ آپ اپنے عوام کو کیونکر اس مقام اور تیاری تک لے جا سکیں گے جہاں آپ اپنے نصب العین کے حصول کے قابل ہو سکیں۔ یہ کوئی شاہی سڑک نہیں۔ اس لئے میرے نوجوان دوستو! سب سے پہلے قومی تعمیر کے مختلف

شعبوں پر اپنے دل و دماغ کو بروئے کار لائیے۔ (خطبۂ صدارت قائدِاعظمؒ ۲ مارچ ۱۹۴۱ء)
اس خطاب کے ٹھیک آٹھ دن بعد قوم کا کہن سال رہنما علی گڑھ یونیورسٹی کے شاہین بچوں کو خطاب کر رہا تھا۔ ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کے زیرِاہتمام نوجوانانِ ملت کے اجتماعِ عظیم میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ اور اُن کی عقابی روح کو جھنجھوڑتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

وزیرِہند مسٹر ایمرے آج یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ نو کروڑ مسلمانوں کو ایک جداگانہ دستوری عنصر کی حیثیت حاصل ہے وہ کوئی عددی اقلیت کی طرح نہیں۔ اور ان کی منشا کے خلاف ان پر کوئی دستور ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آج وحدتِ ہند کا ستون ٹوٹ چکا ہے۔ بلکہ پوری طرح مسمار ہو گیا ہے۔ (ایضاً صہ ۲۰۲)

اور اس کے بعد انہوں نے واضح کیا کہ:

پاکستان ایک قابلِ عمل نصب العین ہی نہیں بلکہ اس برِصغیر میں اسلام کو مکمل تباہی سے بچانے کا واحد راستہ ہے۔ ابھی ہم نے ایک طویل منزل طے کرنی ہے۔ بلاشبہ پاکستان موجود ہے لیکن ہم نے اسے حاصل کرنا ہے۔ آزادی کا حصول اس کے تحفظ کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے۔ انگلستان اور امریکہ آج آزاد ہیں، لیکن سوچئے کہ اپنی آزادی کے استحکام کے لئے انہیں کس قدر شدید جدوجہد کرنی پڑی۔ ہمیں اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرنا ہے۔ اپنی صفوں کو مضبوط کیجئے۔ ہمارے سامنے نہ صرف داخلی تحفظ کے مسائل ہیں بلکہ خارجی جارحیت کا مقابلہ بھی۔ آزادی کا حصول اور اس کا بقاء و استحکام چرخہ کاتنے سے ممکن نہیں۔ ہمیں اپنے مساکن اور مقدس مقاصد کی خاطر لڑائی اور دفاع کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور یقین رکھیئے کہ پاکستان تمہارے ہاتھوں میں ہوگا۔ (ایضاً صہ ۲۶۲)

اجلاسِ مدراس

لاہور کے تاریخی اجلاس (مارچ ۱۹۴۰ء) کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اپریل ۱۹۴۱ء میں مدراس کے مقام پر ہوا۔ اس عظیم قومی اجتماع سے قبل مارچ کا پورا مہینہ قائدِاعظم نے پرہجوم مصروفیات میں گذارا۔ لاہور، علی گڑھ اور کانپور کی کانفرنسیں اور شب و روز کی مسلسل تگ و تاز ان کی صحت پر اثر انداز ہوئی اور بمبئی کو واپس جاتے ہوئے وہ خرابیٔ صحت کا شکار ہو گئے۔ اجلاسِ مدراس میں ان کی شرکت فرمائی اشد ضروری تھی۔ چنانچہ وہ اسی حالت میں عازمِ مدراس ہو گئے۔ دورانِ سفر بے ہوشی کا غلبہ ہوا اور مدراس پہنچتے پہنچتے طبیعت اس قدر ناساز ہو گئی کہ بہت سے اندیشے اُبھر کر سامنے آ گئے۔ اسلامیانِ مدراس شاہانہ استقبال کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ لاکھوں کا اجتماع ریلوے سٹیشن سے باہر اپنے محبوب قائدؒ کی راہ میں آنکھیں بچھانے کے لئے بے تاب کھڑا تھا۔ لیکن جب سپیشل ٹرین سٹیشن پر پہنچی اور انہیں معلوم ہوا کہ ان کی قومی تقدیر کا پاسبان ناسازیٔ طبع کے باعث جلوس میں شرکت سے معذور ہے تو ہیجان و اضطراب کی لرزشوں نے ان کے دلوں میں تہلکہ سا مچا دیا۔ بڑا ہی اثر انگیز اور قابلِ دید یہ منظر تھا۔ جب ہزاروں اور لاکھوں فرزندانِ توحید لرزتے ہوئے دلوں اور خلوص و محبت کے آنسوؤں

سے اپنے محبوب زعیم کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ قائداعظمؒ جلسہ میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن یہ شاید ان خلوصِ مجسم دعاؤں کا اثر تھا کہ ناسازیٔ طبع کے باوجود جب وہ صدارتی خطاب کے لئے مائیک کے سامنے آئے تو ان کی پُرعزم آواز میں گویا بجلیاں سی تڑپ رہی تھیں۔ اور مسلسل دو گھنٹوں تک ان کا وہ انقلاب آفریں خطاب جاری رہا جس میں ملکی سیاسیات کا عالمانہ تجزیہ تھا۔ منزلِ مقصود کی کٹھن گھاٹیوں کی نشاندہی تھی، ذوقِ سفر کے تقاضوں کی تفصیل تھی۔ دلائل و براہین کی آب و تاب تھی۔ سنگِ نشانوں (LAND MARKS) کا تعین تھا۔ غیروں کو انتباہ تھا۔ اپنوں سے اپیل تھی۔ قائداعظم کے اس خطبۂ صدارت کو بجا طور پر ایک حکیمِ سیاست کا شاہکار اور ایک سالارِ انقلاب کی محشر خیز للکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس صدارتی خطاب کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

یقین مانیئے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد مسلمان اس قدر منظم، اس قدر زندہ اور ایسے بیدار کبھی نہ ہوئے تھے جیسے کہ آج ہیں۔ آج ہمارے سروں پر ہمارا اپنا پرچم لہرا رہا ہے یعنی ہندی مسلمانوں کا ملی پرچم۔ ہم نے ایسا پلیٹ فارم قائم کر لیا ہے جو مسلمانانِ ہند کی وحدت کا مظہر ہے۔ ہم نے نہایت واضح الفاظ میں متعین کر دیا ہے کہ ہمارا نصب العین پاکستان ہے۔

اراکینِ مسلم لیگ کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

آپ کے سامنے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس قسم کی تربیت دیں کہ وہ دنیائے سیاست میں الفاظ و جذبات اور اعمال کے اعتبار سے نہ صرف اس ملک میں بلکہ ساری دنیا میں ممتاز ہو جائیں۔ اور اس قابل ہوں کہ وہ ہر وقت مشکلات سے نبرد آزمائی کے قابل ہو سکیں۔

مسلم لیگ کی آئیڈیالوجی کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

مسلم لیگ کی آئیڈیالوجی مسلم ہندوستان اور خود مختار قومیت کے بنیادی اصولوں پر استوار ہوتی ہے۔ اور پھر اس کوشش کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا جو ہماری قومیت، سیاسی تشخص یا ملی وجود کو ختم کرنے کے لئے بروئے کار لایا جائے گا۔ ایسی کوشش سعیٔ ناکام ثابت ہوگی۔ ہم یہ عزم صمیم لے کر اٹھے ہیں ــــ اور اس بارے میں کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا چاہیئے ــــ کہ اس برصغیر میں ایک آزاد قوم کا منصب حاصل کریں اور ایک خود مختار مملکت کا قیام عمل میں لائیں۔

(تقاریر و تحریراتِ جناح - جلد اول - صفحہ ۲۰)

دراوڑ قوم کے افراد کا ذکر کرتے ہوئے جو ہزاروں کی تعداد میں شریکِ اجلاس تھے قائداعظمؒ نے ان کی فریب خوردگی اور زبوں حالی پر مخلصانہ ہمدردی کا اظہار کیا اور فرمایا۔

یہ سرزمین حقیقی معنوں میں دراوڑستان ہے۔ غور فرمائیے کہ تین فی صد اعلیٰ ذات کے برہمن، کس طرح اپنی شاطرانہ چالوں اور پُرفریب ہتھکنڈوں سے یہاں اکثریت بن بیٹھے ہیں۔ کیا جمہوریت اسی کا نام ہے یا یہ ایک فریبِ محض ہے؟ یہی وہ صورت ہے جس کی بنا پر میں یہاں کے غیر برہمنوں کے لئے انتہائی ہمدردی اور ہر ممکن امداد کا اعلان کرتا ہوں۔ ان کے نام میرا پیغام یہ ہے کہ

اُٹھیے اور خود شناسی سے کام لیجئے۔ اپنی ثقافت اور اپنی روایات کے مطابق زندگی بسر کیجئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندی زبان نے یہاں اپنے قدم نہیں جمائے۔ تمہاری روایات کا تقاضا ہے کہ اپنے نظریات کی روشنی میں آگے بڑھئے۔ میں آپ کے مقاصد سے گہری وابستگی کا اظہار کرتا ہوں اور دراوڈستان کے قیام میں آپ کو حتی الامکان امداد مہیا کرنے کو تیار ہوں۔ یقین رکھئے کہ صوبہ مدراس کے سات فی صد مسلمان آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے اور باہمی مساوات، انصاف اور خیر سگالی کے اصولوں پر آپ کی رفاقت کریں گے۔ (ایضاً ص ۲۷۹)

کرپس مشن اور قائدِ اعظم

مسلم لیگ کے اجلاس مدراس کے بعد سر سٹیفورڈ کرپس کی ہندوستان آمد سیاسیاتِ ہند کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ ہندوستان کی سرحدوں کی طرف جاپان کے بڑھتے ہوئے قدم بوجہ جیک کی عالمگیر اڑانوں کے لئے ایک واضح خطرہ بن کر سامنے آ رہے تھے۔ اور برطانوی سامراج کے نمائندوں کی سیاسی مصلحتوں نے پوری شدت سے اپنی مفاد پرستیوں کے اس تقاضے کو محسوس کیا کہ ہندوستان کی قومی زندگی کے مختلف عناصر کو ایک عارضی حکومت کے نظام میں شریک کرنا اور اس طرح ان کا تعاون اور اشتراکِ عمل حاصل کر کے حملہ آور دشمنوں سے نبٹنا اشد ضروری ہے۔ چنانچہ برطانوی حکومت کے اس مشن کی تکمیل کے لئے فرنگی سیاست کے مشہور مہرہ باز، سر سٹیفورڈ کرپس، مارچ ۱۹۴۲ء میں دلی پہنچے اور یہاں پہنچ کر عارضی حکومت کے قیام کی تجاویز یہاں کی سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے سامنے پیش کر دیں۔

سر سٹیفورڈ کرپس کا ورودِ ہند، ہندو کانگرس کے لئے مسرت اور شادمانی کی نوید تھی۔ اس سے قبل کانگرسی لیڈروں سے ان کی کافی رسم و راہ تھی۔ وہ آنند بھون میں پنڈت نہرو کی مہمان نوازیوں سے بھی لطف اندوز ہو چکے تھے۔ چنانچہ سر کرپس کی آمد کی خبر سے وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ گویا حکومت کی باگ ڈور چپکے سے کانگرس کو سونپ کر واپس ہو جائیں گے اور ہندو راج کے سہانے خوابوں کو عملی صورت اختیار کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جہاں ایک طرف ہندو قوم خوشی کے شادیانے بجا رہی تھی وہاں یہ صورتِ حال ملتِ اسلامیہ کے لئے ہیجان و اضطراب کا سامان بن رہی تھی۔ ملت کے ایک ایک بہی خواہ کے سینے میں یہ اندیشہ جاگزیں ہو رہا تھا کہ اگر سر کرپس کانگرس کا حقِ نمک ادا کرنے پر اتر آئے تو کیا ہو گا۔

یہ تھی وہ صورتِ حال جبکہ سر کرپس نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو دلی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہی تاریخ حسنِ اتفاق سے "یومِ پاکستان" کی تاریخ تھی۔ اس روز ملک کے طول و عرض میں دس کروڑ مسلمان قراردادِ پاکستان کے تجدیدِ عہد کے سلسلے میں پورے جوش و خروش سے سالانہ تقریب منا رہے تھے۔ کرپس دلی میں موجود تھے اور قائدِ اعظم بھی۔ اسلامیانِ دلی کا عظیم الشان جلوس پورے جاہ و جلال سے دلی کے بازاروں سے گذرا اور اُردو پارک کے وسیع میدان میں ان کے محبوب قائدِ اعظم نے انہیں مخاطب کیا۔ عزم و استقلال کا عظیم و جلیل پیکر ایک مردِ مومن کا یقینِ محکم سینے میں لئے وابستگانِ ملت کو خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کر رہا تھا۔ اس کی بھرپور آواز جامع شاہجہانی کے میناروں سے ٹکرا رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا:-

میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ دیگر جماعتوں سے کہیں زیادہ مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کی علم بردار ہے۔ ہم عدل و انصاف اور راستبازی کے طلبگار ہیں۔ ہم دوسرے فرقوں سے کسی جلبِ منفعت کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم اس ملک میں ایک آزاد اور خود مختار قوم کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اقلیت ہرگز نہیں بلکہ قوم ہیں۔

سر سٹیفورڈ کرپس کی سفارت کے بارے میں میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ جبتک ہز مجسٹی کی حکومت کی تجاویز ان کے سامنے پیش کی جائیں وہ صبر و ضبط سے کام لیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ تجاویز مسلمانوں کے خلاف ہوں گی تو ہم نہ صرف انہیں مسترد کر دیں گے بلکہ اپنی پوری طاقت سے اس کے مزاحم ہوں گے اور اس کوشش میں اگر جان بھی دینی پڑے تو لڑتے ہوئے جان دیدیں گے۔ میں حکومت کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ مسلم لیگ کو دبانے یا اس کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے..... مسلمانوں کو اس کا اندیشہ ہے کہ سر سٹیفورڈ کرپس کانگرس کے دوست ہیں۔ وہ آنند بھون میں پنڈت جواہر لال نہرو کی مہمان نوازی کا لطف اٹھا چکے ہیں۔ یہ سب صحیح ہے۔ لیکن ہمیں محض اس وجہ سے خوفزدہ نہ ہونا چاہیئے۔ آپ ذرا حوصلے سے کام لیں۔ سر سٹیفورڈ کرپس خالگی حیثیت سے نہیں بلکہ برطانوی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے ہندوستان آئے ہیں۔ اس لئے حکومت برطانیہ کی جو تجویز یا منصوبہ وہ اپنے ساتھ لائے ہیں جب تک ہمارے سامنے نہ آجائے ہمیں صبر سے کام لینا چاہیئے۔ (قائداعظم محمد علی جناحؒ۔ ص ۵۵۱، ۵۵۲)

حکومت اور کانگرس کے حاشیہ بردار مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

یہ صحیح ہے کہ برطانیہ اور کانگرس کے چند "مسلمان دلالوں" کے ذریعے مسلم لیگ میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کانگرس کے پروردے ہیں اور برطانوی شہنشاہیت کے معین و مددگار۔ کسی نہ کسی طرح ہندو اخبارات، ان کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے مسلمان ہمارے لئے قابلِ قبول ہی نہیں جو دشمن کے لشکر میں جائیں اور وہاں سے ہم پر تیر چلائیں۔ مسلمانوں اور مسلم لیگ میں تفرقہ اندازی کی کوشش بالکل بے سود بلکہ ایک بے ہودہ تماشا ہے۔ کیونکہ آپ نے دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کا واحد نمائندہ ادارہ ہے۔ (ایضاً)

۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو حکومت برطانیہ کی وہ تجاویز جو سر کرپس ساتھ لائے تھے شائع کر دی گئیں۔ یہ موقع نہیں کہ ہم ان تجاویز کے طویل سلسلہ کی تفاصیل پیش کر سکیں۔ ان تجاویز کا لب لباب یہ تھا کہ اختتام جنگ کے فوراً بعد ایک منتخب دستور یہ کے ذریعے ہندوستان کو حکومت خود اختیاری سونپ دی جائے گی۔ اور جو صوبے دستور ساز اسمبلی کے مرتبہ دستور کو تسلیم کرنے پر رضامند نہیں ہوں گے۔ انہیں اپنے لئے ایک علیحدگانہ دستور کی تدوین اور اس کے مطابق خود مختارانہ حیثیت اختیار کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی موجود تھی کہ انتقال اختیارات کے سلسلہ میں ملک معظم کی حکومت اور ملک کے مجموعی طور منتخب دستوری ادارہ میں ایک معاہدہ طے پائے گا اور اس معاہدہ کے ذریعے اسے مکمل اختیارات سونپ

دیئے جائیں گے۔

ان تجاویز میں یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ موجودہ نازک دور اور نئے آئین کی تشکیل تک ایک عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ جس میں ملک کی اہم جماعتوں کے قائدین کو شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی۔

کرپس تجاویز کے منظرِ اشاعت پر آتے ہی کانگرس کی ساری خوش فہمیاں ماند پڑ گئیں، تجاویز میں صوبوں کے لئے یہ آزادی موجود تھی کہ وہ چاہیں تو اپنے لئے الگ دستور مرتب کر لیں۔ بالفاظِ دیگر مطالبۂ پاکستان کو مبہم انداز میں تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس بناء پر پورے ملک میں ہندو راج کا سہانا خواب خوابِ پریشان ہوتا نظر آ رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف کانگرس نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ "یہ ایک زائد المیعاد چیک ہے"۔ اور دوسری طرف مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ عارضی حکومت کے قیام سے قبل نظریۂ پاکستان اور مسلمانوں کے حق خود ارادیت کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کر لیا جائے اور پوری تفصیلات اختتامِ جنگ پر زیرِ بحث لائی جا سکتی ہیں۔ چونکہ حکومت نے اپنی ان تجاویز کو ناقابلِ ترمیم قرار دیا تھا اس لئے عاملہ مسلم لیگ نے قائدِ اعظمؒ کی قیادت میں ایک طویل اور مسکت قرارداد کے ذریعے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔

قائدِ اعظمؒ نے ۴ اپریل ۱۹۴۲ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں پوری وضاحت سے ان تجاویز کا تجزیہ کیا اور پھر ۱۳ اپریل کو ایک پریس کانفرنس میں مذکورہ تجاویز کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور فرمایا۔

> ہم نے تمام تجاویز کو ایک دستاویز کی طرح جانچا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مستقبل کے لحاظ سے اس میں تقسیم (پاکستان) کے اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ تاہم کسی صوبے یا صوبوں کے لئے حق علیحدگی بھی دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے جو طریقہ بتایا گیا ہے اس کے پیشِ نظر ہمارا خیال ہے کہ اسلامی صوبوں میں طریق کار کے ضابطے کچھ اس طرح وضع کئے گئے ہیں کہ دس کروڑ مسلمانوں کی قسمت صوبائی مجالس آئین ساز میں چند راؤں سے بندھی رہے گی .... اس کے علاوہ نہ پاکستان کو اور نہ مسلمانوں کے حق خود ارادیت کو صاف طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے یہ تجاویز رد کر دیں۔
>
> (قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ۔ صفحہ ۵۶۲)

کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے اپنے موقف کی روشنی میں کرپس تجاویز کو مسترد کر دیا۔ کرپس مشن کے مقاصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس کی بدولت ایک اہم حقیقت پوری طرح نکھر کر منظرِ عام پر آ گئی کہ پورے ملک کی نمائندگی کے متعلق کانگرس کے بلند بانگ دعووں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور امریکہ و انگلستان اور دیگر ممالک میں اس کے بے پناہ پروپیگنڈے کی حقیقت پوری دنیا کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہے۔ کرپس مشن نے کانگرس کی اشیرباد حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ اس حقیقت سے انکار کی جرأت نہ کر سکا کہ دس کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا قطعی حق اب مسلم لیگ اور صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے۔

اور کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندگی کا حق رکھتی ہے اور وہ بھی سارے ہندوؤں کی نہیں بلکہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی۔ کرپس مشن کی وجہ سے جو دوسرا صدمہ کانگرس کو برداشت کرنا پڑا وہ یہ تھا کہ مبہم الفاظ میں نظریۂ پاکستان کا اعتراف کر لیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مسلم لیگ قطعی، دوٹوک، واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ایسا اعلان چاہتی تھی۔ یہ دونوں صدمے کانگرس کے لئے ناقابلِ برداشت تھے۔ غم و غصہ کی اس کیفیت میں ان کے لئے اپنے دماغی توازن کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔

گاندھی جی نے "ہری جن" میں دھڑا دھڑ پاکستان کے خلاف مضامین کی اشاعت شروع کر دی اور پنڈت نہرو نے اپنے واویلا سے دنیا کو متاثر کرنے کے لئے لاسلکی کے ذریعے ایک مضمون امریکہ بھیجا جو نیویارک ٹائمز میں شائع ہوا۔ کتنا بڑا فریب تھا جو دنیا کو دیا جا رہا تھا اس کا اندازہ پنڈت جی کے مذکورہ مضمون کے اس اقتباس سے لگائیے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

> ایک مٹھی بھر لوگوں کے سوا، ہندوؤں اور مسلمانوں میں نسلی، تہذیبی اور لسانی قسم کے اختلافات نہیں ہیں۔ آجکل کچھ مسلمان ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس مطالبہ کی عمر مشکل سے چار سال ہے۔ کچھ لوگوں نے اس مسئلہ کو بڑا سنجیدہ مسئلہ بنا رکھا ہے۔ (نیویارک ٹائمز۔ ۱۹ جولائی ۱۹۴۲ء)

دس کروڑ انسانوں کی عظیم الشان قوم کی متفقہ آواز کو جس نے فضائے ہند میں زلزلہ طاری کر رکھا تھا۔ "مٹھی بھر لوگوں" کا مطالبہ قرار دینا ہندو کانگرس کے پروپیگنڈے کی پستی کی انتہا ہے۔ کس قدر درست لکھا تھا ہیورلی نکلس نے کہ:۔

> اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندو سرمایہ دار اپنی اغراض کی خاطر آخری دم تک پاکستان کے خلاف لڑیں گے۔ وہ دنیا میں خوب شور مچائیں گے اور مادرِ ہند کے ٹکڑے کئے جانے کے خلاف پُرزور پروپیگنڈہ کریں گے۔ یقیناً ہندو سرمایہ دار روئیں گے۔ چیخ و پکار مچائیں گے۔ دھمکیاں دیں گے۔ رشوت دیں گے اور دنیا کو فریب میں مبتلا کرنے کے لئے ایسے سربرآوردہ ہندوؤں کی خدمت حاصل کریں گے جن کو ہندو قومیت کے جذبے نے واقعات سے اندھا کر رکھا ہے۔ (ورڈکٹ آن انڈیا)

پھر وہ پنڈت جی کے مذکورہ مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> دس کروڑ کی مہیب تعداد کو پنڈت جی نے "کچھ" کے لفظ سے تعبیر کرنا پسند فرمایا ہے، معلوم نہیں کیوں؟ "زندگی یا موت" کا عزم رکھنے والی ایک زبردست قوم کے طوفانی جذبات کو پنڈت جی یوں ظاہر کرتے ہیں ــــ "کچھ لوگوں نے اس مسئلہ کو بڑا سنجیدہ مسئلہ بنا رکھا ہے"۔

قارئین کرام! میں نے آپ کو متنبہ کر دیا ہے۔ باوجود اس شور و شغب اور اس غلط پروپیگنڈے کے اس سلطنت کا نقشہ دنیا کے انصاف پسند حضرات کے ذہنوں میں مرقسم ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان پر سخت تنقیدیں کی جائیں گی۔ اس کے خلاف جھوٹ تراشے جائیں گے۔

اس کے بارے میں غلط بیانیوں کا طوفان برپا کیا جائے گا۔ لیکن مجھے یقین واثق ہے کہ پاکستان ان تمام آزمائشوں سے کامیاب ہو کر نکلے گا۔ میں اس بات پر اپنے کامل یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ یہ سلطنت ایک دن ضرور بضرور وجود میں آئے گی۔ (ایضاً)

قراردادِ لاہور کے بعد دو سال کے اندر اندر مسلم لیگ اور قائدِ اعظم دس کروڑ اسلامیانِ ہند کی واحد نمائندگی کے مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ کرپس مشن کی واپسی کے بعد یہ سب کچھ سیاساتِ ہند میں ایک حقیقتِ ثابتہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ بساطِ سیاست پر کانگرس کے تمام مُہرے قائدِ اعظمؒ کے حسنِ تدبّر سے مات کھا چکے تھے اور دوسری طرف حکومتِ برطانیہ کے کارفرماؤں نے اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا کہ اس نازک اور کٹھن مرحلہ پر دس کروڑ مسلمانوں کی منظم قوت کو نظر انداز کرنا ناقابلِ بیان خطرات کا سامان بن جائے گا۔ چنانچہ ۲ ستمبر ۱۹۴۲ء کو جب کہ کانگرس "ہندوستان چھوڑ دو" کی باغیانہ تحریک کے نام پر (بقول قائدِ اعظمؒ) آخری پانسہ پھینک چکی تھی، وزیرِ اعظم برطانیہ نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ:

کرپس کی مساعی کو انڈین کانگرس پارٹی نے مسترد کر دیا ہے۔ لیکن اس سے معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ انڈین کانگرس پارٹی تمام ہندوستان کی نمائندہ نہیں ہے۔ وہ پورے ہندو عوام کی بھی نمائندگی نہیں کرتی۔ وہ ایک سیاسی تنظیم ہے جو پارٹی مشین کے اردگرد تعمیر کی گئی ہے اور جو کاروباری اور سرمایہ داروں کے مفاد سے وابستہ ہے۔ اس جماعت سے باہر اور اس سے بنیادی اختلاف رکھنے والے برٹش انڈیا میں نو کروڑ مسلمان ہیں جن کو اپنے خیالات کے اظہار کا پورا حق حاصل ہے۔ (تقسیم ہند۔ ص۲۳۸)

آیئے! اب آگے بڑھیں۔

کرپس مشن کے بعد

سر سٹیفورڈ کرپس حکومت برطانیہ کے نمائندہ خصوصی بن کر یہاں تشریف لائے تھے۔ ان کا مشن ہندوستان کے لئے ایک تقدیرِ نو کی سرکاری دعوت تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان کی آمد پر ہندو جاتی اور اس کی نمائندہ کانگرس اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ کانگرسی لیڈروں کی ملکِ معظم کی حکومت کے اس ممتاز نمائندے سے دیرینہ راہ و رسم اور مہمان نوازی اب رنگ لائیں گی۔ اور آنند بھون میں راز و نیاز کی سہانی چشمکوں کے حاصلِ مقصود تک پہنچنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ چنانچہ سر کرپس کی آمد پر کانگرس نے گھی کے چراغ جلائے اور ہندو جاتی نے خوشی کے شادیانوں سے ان کا سواگت کیا۔ لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

جس دن سر کرپس اپنے مشن کی ناکامی کے بعد، ہوا کے دوش پر واپس جا رہے تھے کانگرسی لیڈروں کے چہروں پر مایوسی اور شکست کا غبار چھا رہا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کی گہری فراست نے سازشوں کے ہر جال کو توڑ کر رکھ دیا اور سر کرپس اور ملکِ معظم کی حکومت دونوں پر واضح کر دیا کہ دس کروڑ مسلمانوں کی قومی آرزوؤں اور امنگ

کی پامالی اور مطالبۂ پاکستان سے گریز کی راہیں اختیار کرنا اب کسی طاقت کے بس کا روگ نہیں رہا۔ اسلامی ہند کے حق خود ارادیت سے انکار و انحراف بدترین نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور ملتِ اسلامیہ ہر ایسے چیلنج کو مردانہ وار قبول کرے گی جو اس کی تحریکِ استقلال کے منافی ہو۔

قافلہ آگے بڑھتا ہے۔ اور عزم و یقین اور ذوقِ سفر کے پورے ساز و سامان کے ساتھ اس کے قدم اپنی منزل پر اُٹھ جاتے ہیں۔ یہ منزلِ اوّلین مرحلوں سے کہیں بڑھ کر ابتلا و آزمائش کا کڑا سفر ہے۔ یہاں قدم قدم پر نئے خطروں کے الارم ہوتے ہیں۔ قدم قدم پر سازشوں کے ہمرنگ زمیں دام پھیلائے جاتے ہیں۔ جگہ جگہ وہ نازک موڑ سامنے آتے ہیں کہ افرادِ کارواں ہراساں ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بارہا یہ اندیشے ابھر کر سامنے آتے ہیں کہ وارھا کے سامری اور ساحرِ افرنگ کی مہرہ بازیاں بساطِ سیاست پر ہم آویز ہو کر ملتِ اسلامیہ کو مات دینے پر تل گئیں۔ لیکن آنکھ کی جھپک میں نگاہِ مردِ مومن نے سب کچھ بھانپ لیا اور حسنِ فراست سے یہ ساری بساط الٹ کر رکھ دی۔ کرپس مشن کا حسرت ناک انجام اسی حقیقت کا آئینہ دار تھا اور اس سے واضح ہو گیا کہ جب تک مطالبۂ پاکستان کو خیر مبہم واضح اور دو ٹوک الفاظ میں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ہندوستان کے سیاسی تعطل اور دستوری الجھنوں کا حل نہیں مل سکے گا۔

جواری کا آخری پانسہ

کانگرس نے کرپس مشن سے مطالبہ کیا تھا کہ اپنی سرکاری تجاویز کو بالائے طاق رکھ کر نیشنل گورنمنٹ کے ذریعے تمام اختیارات اسے سونپ دے۔ لیکن قائدِ اعظم کی پرزور دھمکی کی بنا پر مسٹر کرپس ہندو راج کے منصوبے کی تکمیل میں کوئی امداد نہ کر سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کرپس مشن کی روانگی کے دو ہفتہ بعد آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے کرپس تجاویز کو مسترد کر دیا۔ کانگرس کی مایوسی اور شکست کے زخم اس سے بھی مندمل نہ ہو سکے اور ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو اپنی مجلسِ عاملہ کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے اس نے اجلاس بمبئی میں برطانیہ کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" (QUIT INDIA) کی مہم چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ جنگِ عظیم کے نازک ترین مرحلہ پر اس قسم کی مہم کن دور رس اور خطرناک نتائج کا پیش خیمہ بن سکتی تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اس پر بھی غور کیجئے کہ اگر انگریز ان گیدڑ بھبکیوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر تمام اختیارات کانگرس کے سپرد کر دیتا تو اسلامیانِ ہند کا مستقبل کس طرح تیرہ و تار ہو کر رہ جاتا اور ہندو کی غلامی کیونکر انہیں ابدی موت کی گہری نیند سلا دیتی۔

قائدِ اعظمؒ کا انتباہ

قائدِ اعظم اس مہم کے نتائج و عواقب سے پوری طرح آگاہ تھے اور پوری طرح جانتے تھے کہ اس موقع پر ملتِ اسلامیہ کی خاموشی کا انجام کیا ہوگا۔ چنانچہ اس مہم کا آغاز ہوتے ہی انہوں نے ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو ایک اخباری اعلان میں فرمایا۔

> یہ تسلیم کرنا ممکن نہیں کہ کانگرسی لیڈر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ یہ مہم نہ صرف تشدد پر منتج ہوگی، بلکہ بے گناہ انسانوں کی تباہی اور خوں ریزی پر بھی۔ یہ امر مزید افسوس ناک ہے کہ اس نازک مرحلہ پر یہ تحریک اس لئے شروع کی گئی ہے کہ ان مطالبات کو بزور منوایا جائے جنہیں تسلیم کرنے کا نتیجہ عام مفادات اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کے مطالبات کی قربانی ہوگا۔ میں نے ۱۶ اگست کو آل انڈیا مسلم لیگ کی

مجلس عاملہ کا اجلاس بمبئی میں طلب کیا ہے اور پیشتر اس کے کہ عاملہ کوئی فیصلہ کرے میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس تحریک سے کلیتہً الگ رہیں۔ اور کانگرسی کارکنوں کی دھمکیوں اور تخویف سے بے نیاز رہتے ہوئے پُرامن طور پر روزمرہ کے کاروبار میں منہمک رہیں۔

میں کانگرسی کارکنوں کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے وہ مسلمانوں کو مرعوب اور ہراساں کرنے کی کوششوں سے باز رہیں۔ مسلمانوں کو مرعوب اور مجبور کرنے کی کوشش انتہائی تلخ نتائج پیدا کر دے گی اور کانگرسی کارکنوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

(تقاریر و تحریرات جناحؒ جلد اول۔ صـ۴۴۳)

۱۳ ستمبر ۱۹۴۲ء کو نئی دہلی کی ایک عظیم صحافتی کانفرنس میں جہاں برطانیہ، امریکہ، چین اور ہندوستان کے ممتاز اخبارات کے نمائندے موجود تھے۔ قائداعظمؒ نے صورتِ حالات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کی یہ مہم جواری کا آخری پانسہ ہے۔ آپ کو مسلم لیگ سے کیا توقع تھی؟ کیا آپ کو امید تھی کہ کانگرس کے اس داؤ پیچ سے واقف ہونے کے بعد مسلم لیگ اس تحریک سول نافرمانی کی تائید کرتی؟ یہ محض برطانیہ ہی کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں بلکہ کانگرسی مطالبات کے لحاظ سے یہ ایک خانہ جنگی ہے۔ کیونکہ اس کے مطالبات مفادِ اسلامی کے منافی ہیں۔ اگر آزادی اور خود مختاری کے نام پر مسلمان بھی اس تحریک میں شامل ہو جاتے تو مسٹر گاندھی انگلستان امریکہ اور ساری دنیا سے کہتے پھرتے کہ وہی سارے ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے مطالبات کو مسلم ہندوستان کی تائید بھی حاصل ہے۔ اگر مسلمان اس دام تزویر میں آجاتے تو یہ ان کی سب سے بڑی غلطی ہوتی۔

اگر ہمیں انگریزوں کی دیانتداری پر بھروسہ ہوتا تو قدرتی طور پر ہمارے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا کہ ہم ان کے ساتھ مل کر اس تحریک کو کچل دیں۔ کیونکہ اس تحریک کے مقاصد میں ہماری پامالی بھی شامل تھی۔ لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہم انگریزوں پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے داؤں پر ہیں۔ اس لئے ہم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس معاملہ سے بالکل علیحدہ رہیں۔ ان کو آپس میں لڑنے دو۔ یہ انہیں واقعات میں سے ایک ہے جبکہ غیر جانبداری ہی بہترین حکمتِ عملی ہوتی ہے۔ (قائداعظم محمد علی جناح۔ صـ۵۵)

اس کانفرنس میں قائداعظمؒ نے حکومت برطانیہ پر واضح کیا کہ:۔

فرض کیجئے کہ برطانوی حکمت عملی کے خلاف مارے غصے کے میں کل یہ کہہ دوں کہ حکومت سے عدم تعاون کر دو۔ تو یقین کیجئے کہ حکومت آجکل جس قدر مصیبت (کانگرس کے ہاتھوں) بھگت رہی ہے۔ اس سے کم از کم پانچ سو گنا زیادہ اس کو ہمارے ہاتھوں سے بھگتنی پڑے گی۔ یہ بندوق اور تلوار کی بات نہیں۔ مسلمان کا مزاج اور طرزِ تربیت ہی کچھ ایسا ہے۔ (ایضاً صـ۵۵)

قائداعظمؒ سے سوال کیا گیا کہ حکومتِ برطانیہ کے خلاف اگر مسلم لیگ نے ایسا اقدام کیا تو کیا ملک کی افواج اور

سرحدات و اسلامی ممالک کے مسلمان بھی اس سے متاثر ہوں گے؟ اس اہم اور نازک سوال کا جواب دیتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:-

میں خوں ریزی کی ان تفاصیل میں جانا نہیں چاہتا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ میرا فوج سے کوئی رابطہ نہیں لیکن مجھے احساس ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ پینسٹھ فی صد فوج مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مسلم لیگ کا اقدام فوج کے ایک عظیم حصّہ پر اثر انداز ہوگا۔ علاوہ بریں سرحدی علاقوں میں بھی ایک آگ سی بھڑک اُٹھے گی اور جہاں تک افغانستان، ایران، عراق، ترکی اور مصر جیسے مسلم ممالک کی اخباری اطلاعات کا مجھے اندازہ ہے۔ انہیں مسلمانانِ ہند کے مطالبات سے پوری ہمدردی ہے۔ وہاں کے اخبارات بھی مطالبۂ پاکستان کی پُرزور تائید کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے یقین ہے کہ اگر مسلمانوں اور برطانوی حکومت میں لڑائی چھڑ گئی تو وہ لازماً اس سے متاثر ہوں گے۔

کانگرسی مہم کا حسرت ناک انجام

گاندھی جی اور ان کی کانگرس نے بڑے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ حکومت کے خلاف سول نافرمانی اور بغاوت کا اعلان کیا تھا۔ اس سے قبل انگریز کے خلاف ہر ملکی تحریک میں مسلمان نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر مقدمۃ الجیش کی طرح اندھا دھند آگے بڑھتے رہے تھے۔ اپنی طبعی گرم جوشیوں سے وہ ہر تحریک میں شریک ہوئے اور ایوانِ حکومت میں زلزلے طاری کر دیئے۔ کانگرس کا خیال تھا کہ مسلمان اب بھی اپنے فطری جوش سے دیوانہ وار آگے بڑھیں گے۔ اور مسٹر جناحؒ ایک یوسفِ بے کارواں کی طرح تن تنہا کھڑے رہ جائیں گے۔ لیکن اب مسلمانوں کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ قائدِ اعظمؒ کی قیادت نے انہیں یہ نکتہ پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ اس جوش میں انہوں نے بہت کچھ کھو دیا اور اب وقت آگیا ہے کہ آزادی و حریت کے یہ دیوانے جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا سیکھیں۔ سیاسیات کے طوفانوں میں اب انہوں نے پہلی بار خود نگری اور خود گری کے اصولوں کو اپنایا تھا۔ اسی احساسِ خودی نے ان پر یہ حقیقت بے نقاب کر دی تھی کہ آزادی کے نام پر کانگرس کی یہ مہم دراصل ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے حق خود ارادیت کو پامال کرنے کا پُرخطر حربہ ہے۔ اس لئے قائدِ اعظمؒ کی ہدایت پر لبیک کہتے ہوئے وہ کانگرس کی تحریک سے کلیتہً الگ رہے۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ انگریز اور ہندو کی اس پُرفریب لڑائی میں غیر جانبداری کی حکمتِ عملی ہی ان کے لئے سلامتی کی راہ ہے۔ چنانچہ ان کی علیحدگی کا نتیجہ تھا کہ جس مہم کے لئے بڑے کرّ و فر سے پہلا قدم اٹھا تھا ــــ وہ چند ہی دنوں میں گرد راہ بن کر رہ گئی۔ کانگرس ہائی کمان کے لیڈر فی الفور گرفتار کر لئے گئے اور اس کے ساتھ "ساڑھے چھ نک" کے چند رسمی واقعات کے بعد کانگرس اور ہندوؤں کا سارا جوش و خروش قبرستان کی سی خاموشی میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ کانگرس کی پوری تاریخ کی یہ شاید بدترین شکست تھی اور یہ اس بنا پر اُسے نصیب ہوئی کہ اس کی مہاسبھائی ذہنیت نے اسلامیانِ ہند کا اعتماد کھو دیا۔